REGD. L. No

اگست
ادب لطیف

—— ایرب احمد کرمانی

"چودھویں اور پندرھویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ جو مسلمانوں کے اثر سے شروع ہوئی، علم و فضل کی لہریں یونان و روم سے فرانس، اسپین اور انگلستان پہنچیں۔ مغرب نے مشرق سے سیکھا۔ اب مشرق مغرب سے سیکھ رہا ہے۔ خواہ برنارڈشا کی ادبی تخلیقات ہوں یا کیوری اور آئین سٹائن کی سائنسی ایجادات۔ خواہ وہ انقلاب فرانس ہو یا انقلاب روس ہندوستان اور پاکستان بلا امتیاز ان سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اس ذہنی اور تہذیبی رابطہ کو اگر مسٹر ایٹلی اور مسٹر بیون اطلانٹک پیکٹ، ایٹم بم یا کامن ویلتھ کے ذریعہ روکنا چاہتے ہیں تو محض ان کی خواہش سے تاریخی تقاضے نہیں رک جائیں گے۔ ہمیں علم ہے کہ کس طرح زار شاہی کے خاتمے کے بعد وسط ایشیا کے مسلم علاقے کا نیا اور درخشاں دور شروع ہوا ادب اور تہذیب کی کیونکر آبیاری ہوئی۔ قومیتوں کا مسئلہ کیوں کر سلجھایا گیا۔ بھوک فاقے اور بے روزگاری کا کیسے سد باب ہوا — اور اب ہم اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ضرور استفادہ کریں گے —!"

کرمانی

ادب لطیف

چوہدری برکت علی، میرزا ادیب اور قتیل شفائی نے مرتب کیا

مکتبہ — اردو — لاہور

زر سالانہ ــــــ ۸ روپے

فی کاپی ــــــ ایک روپیہ

ترتیب

جلد ۲۸ — جولائی اگست ۱۹۴۹ء — شمارہ ۴، ۵

(امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چوہدری برکت علی پرنٹر پبلشر چھپ کر شائع ہوا)

حرفِ اول - آج سے ٹھیک ایک سال پہلے اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو پولینڈ کے مشہور تاریخی شہر روکلا میں پینتالیس ملکوں کے فنکاروں، ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں نے جمع ہو کر دنیا کو اس خوفناک خطرے سے آگاہ کر دیا تھا جو ڈاؤننگ سٹریٹ کے خود غرضوں اور وال سٹریٹ کے شائلاکوں کی باہمی سازش میں پرورش پا رہا ہے یہ کانفرنس جنگ کی تباہی کے بعد پہلی عوامی امن کانفرنس تھی جسے کرۂ ارض پر بسنے والے اُن تمام لاتعداد عوام کی پرزور تائید حاصل تھی جو امن سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور جنہیں جنگ میں سب سے زیادہ نقصان پہنچا کرتا ہے! سرمایہ دار قوتیں جنگ اسلئے چاہتی ہیں تاکہ وہ ہلاک ہتھیار بنا کر لڑنے والے ملکوں میں بیچیں اور ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر اپنے ذخیروں میں بھر لیں! سرمایہ دار لڑتا ہے، دور بیٹھ کر دولت کے ذخائر میں اضافہ کرتا ہے اور مفتوح ملکوں کو اپنی مصنوعات کی منڈیاں بنا لیتا ہے۔ اسے جنگ سے بے پناہ فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر عوام — عوام سرمایہ داروں سے ہتھیار خرید کر، ان کے اشاروں پر شہروں اور ریگستانوں میں اپنا خون بہا دیتے ہیں۔ اپنی بیویوں کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم بنا لیتے ہیں۔ اور جب جنگ ختم ہوتی ہے تو اناج کے ایک ایک دانے کو ترس ترس کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ روکلا میں اکٹھے ہونے والے عوامی فنکاروں نے زندگی کے ان تلخ حقائق اور مسموم حوادث کو انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا، للکار کر اعلان کیا تھا" آج ساری دنیا کے عوام کی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے خلاف چند خود غرض اور مطلب پرست عناصر دنیا کی تمام قوموں کی روحانی دولت کو لوٹنے کی سازش کر رہے ہیں — اسلئے ہم اپنی آواز بلند کرتے ہیں تاکہ دنیا میں امن قائم ہو، ہر قوم کو آزادی کے ساتھ تہذیبی ترقی کا موقعہ ملے، ہر قوم مکمل طور پر آزاد ہو، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرے"

یہ روکلا کانفرنس کی للکار تھی — وہ روکلا کانفرنس جو آج سے ایک سال پہلے ۲۸ اگست ۱۹۴۸ء کو امن اور تہذیب کے تحفظ کے لئے منعقد ہوئی تھی! اس کانفرنس نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک ایک ہلچل، ایک اضطراب پیدا کر دیا تھا اور لوگ سمجھنے لگے تھے کہ مارشل پلان اور اطلانٹک پیکٹ کے پردے میں کیا مقاصد پوشیدہ ہیں۔ اور ان معاہدوں اور تعاون پسندانہ مساعی کے اصل محرکات کیا ہیں —!

اب عالمی امن و تہذیب کے تحفظ کیلئے ایک اور کانفرنس منعقد ہوئی ہے یہ کانفرنس ۲۰ اپریل سے لیکر پچیس اپریل تک پیرس میں ہوتی رہی ہے اور اسمیں تقریباً ۸۰۰ مندوبین نے شرکت کی ہے امن قائم کرنے کیلئے امن پسندوں کے گروہ نے جو یہ دوبارہ منظم کوشش کی ہے۔ اس نے سامراجی طاقتوں کی صفوں میں ایک زبردست انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اور اس وقت شکست خوردہ فسطائی ذہنیت آنے والے خطرات سے ڈر کر، اپنے متحدہ محاذ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش کر رہی ہے — مگر ظاہر ہے انیگلو امریکی بلاک کی سازشیں اب عوام کی سیاسی بیداری کو دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ امن پسند قوتیں عوام دشمن قوتوں سے امن کی بھیک نہیں مانگتیں۔ بھیک مانگنے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو عوام امن قائم رکھنا اپنا سب سے بڑا حق سمجھتے ہیں — اور امن و تہذیب کی حفاظت کیلئے وہ ہر اس طاقت سے ٹکرانے پر آمادہ ہیں جو بموں، توپوں اور زہریلی گیسوں سے خوبصورت اور جنت نشاں بستیوں، مہذب ملکوں اور حسین و شاداب خطوں کو جہنم بنانے پر تلی ہوئی ہے!

دنیا کی ان دونوں کانفرنسوں میں ہمارے ملک — پاکستان کے نمائندے شامل نہیں ہو سکے۔ مگر پاکستان کے عوام امن کے اسی طرح خواہشمند ہیں جس طرح وہ ملک جن کے نمائندوں کو ان کانفرنسوں میں شامل ہونے کا موقعہ ملا ہے — دنیا کے سب عوام ایک ہیں — ایک ہی صف میں شامل ہیں۔ جغرافیائی حدود ان میں بنیادی امتیازات پیدا نہیں کر سکتے — یہ عوام آج اپنے مشترکہ دشمن کیخلاف صف آرا ہیں، اور ان کے مشترکہ دشمن وہ ہیں، جو انہیں جنگ کے آتشیں شعلوں میں جھونک کر، خود دور رہ کر ہتھیار بناتے ہیں، بلیک مارکیٹ کرتے ہیں اور ساری دنیا کی دولت اپنے قبضے میں لے آتے ہیں —! — پاکستان کے عوام ان کانفرنسوں کی پرزور تائید کرتے ہیں۔ پرزور اور مخلصانہ تائید، اور جب عمل کا وقت آئیگا تو عوام دوست قوتیں پاکستان کے عوام کو اپنی صف میں کھڑے ہوئے پائیں گی —— !!!

غیر جمہوری طرزِ عمل:۔ آجکل رجعت پرست عناصر ترقی پسند اور عوامی تحریکوں کو کس کس انداز سے کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لاہور کے ترقی پسند مصنفین کی جماعت کو ہفت روزہ اجلاس منعقد کرنے کے لئے کہیں بھی جگہ نہیں ملتی! یہ اجلاس پہلے وائی، ایم، سی، اے کی عمارت میں ہوتے تھے۔ اسکے بعد پبلک لائبریری کی بلڈنگ میں ہونے لگے مگر یکم مئی کے بعد وہاں سے جواب مل گیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ سی، آئی، ڈی کے مقرر کئے سپاہی سائے کی طرح انجمن کے ممبروں کے ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں اور وہ بیچارہ انتہائی کوشش کے بعد جلوس کے لئے جو جگہ بھی مقرر کرتا ہے، سپاہیوں کے خفیہ احکام کے ماتحت اس جگہ کے دروازے انجمن کے لئے مقفل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گزشتہ مہینے میں ان لوگوں کو سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جو انجمن کے اجلاس میں شریک ہونا پسند کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جمہوری حکومت ایک عوامی تحریک کے خلاف اس نوعیت کے غیر جمہورانہ اقدامات کیونکر کر سکتی ہے۔ اور کیا یہ اسکی شان کے شایاں ہے کہ اپنے اعلےٰ درجے اور بلند پایہ ادیبوں کو اس طرح پریشان کرے! شاید ہمارے محترم اربابِ بست و کشاد کو یہ حقیقت معلوم نہیں کہ ان کے مقرر کئے

ہوئے سپاہی انجمن کے ممبروں پر پابندی لگا سکتی ہے، مگر ان تصورات پر اپنی کمند نہیں پھینک سکتے جو اس سرزمین میں ہر طرف تک پھیلے ہوئے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہیں — یہ تصورات زندہ ہیں — زندہ رہیں گے — اور لاکھوں پابندیوں کے باوجود آگے بڑھتے رہیں گے!

خفیہ پولیس کے اس طرزِ عمل کو، نظریاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ملک کی کوئی انجمن استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھ سکتی چنانچہ مجلس ادب نے اپنے ہفتہ وار اجلاس میں ایک قرار داد منظور کر کے گورنر پنجاب اور سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خفیہ پولیس کے اس طرزِ عمل کی مذمت کریں۔ جو انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کے سلسلے میں روا رکھا ہے۔

اس قرار داد میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ ہمیں انجمن ترقی پسند مصنفین سے نظریاتی اختلاف ہے مگر پھر بھی ہم خفیہ پولیس کے اس غیر جمہوری رویّے کی مذمت کرتے ہیں۔

جعفری کی دوبارہ گرفتاری:۔ حکومت بمبئی نے اپنے مخصوص مصالح کے پیش نظر مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کو گرفتار کر لیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ رہا ہو گئے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے انہیں دوبارہ جیل خانے میں ڈال دیا ہے۔

جعفری ہندوستان و پاکستان کے محبوب عوامی شاعر ہیں۔ دونوں ملکوں میں ان کی حیات آفریں شاعری یکساں طور پر مقبول ہے اور دونوں ملکوں کے عوام انہیں اپنا حقیقی ترجمان سمجھتے ہیں۔ اسلئے ان کی گرفتاری — پر ہر جگہ احتجاج ہو رہا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ حکومت نے وہ الزام بتانے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی جو ان پر لگایا گیا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی گرفتاری معرضِ عمل میں لائی گئی ہے:۔ بمبئی کے ترقی پسند ادیب بمبئی کے ہوم منسٹر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کہ انہیں جعفری کے جرم سے آگاہ کیا جائے۔ مگر ان کی یہ کوشش رائگاں گئی۔ ہوم منسٹر نے کوئی الزام کی توجیہہ کی اور نہ اس بات پر رضامند ہوئے کہ کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا جائے!

حکومت بمبئی کا یہ اقدام — جمہوری نقطہ نظر سے سخت غیر آئینی ہے۔ اور ہم اس غیر آئینی اقدام کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں:۔

اُردو کالج:۔ غیر منقسم ہندوستان میں انجمن ترقی اردو، نے اُردو کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں وہ تاریخ اُردو کا ایک مستقل اور نہایت اہم باب بن چکی ہیں۔ انجمن نے اُردو کے تصنیفی اور تالیفی شعبوں میں ایسا کام کیا ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ قیام پاکستان کے بعد جب انجمن دہلی سے کراچی چلی آئی تو ہم یقیناً یہ توقع قائم کرنے میں حق بجانب تھے کہ انجمن کے بلند ہمت ناظم اور ان کے شرکار کار اُردو کو پاکستان میں ہمہ گیر اور ہمہ رس، بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور ہمیں مسرت ہے کہ انجمن نے اُردو کالج کے قیام سے اپنے بہت بڑے اور نہایت اہم کارنامے کا آغاز کر دیا ہے " انجمن ترقی اردو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اُردو کی تنگ دامانی کے متعلق جو رائیں قائم کی گئی ہیں۔ وہ قطعاً درست نہیں،، چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر کراچی میں اردو کالج قائم کیا گیا ہے جس میں سندھ یونیورسٹی کے نصاب کی تعلیم انگریزی کے بجائے اُردو میں دی جائے گی۔

انجمن کا یہ اقدام — ایک تاریخی حیثیت لئے ہوئے ہے اور ہمارے عوام انجمن کے اس اقدام پر بڑی مسرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں کامل امید ہے یہ کالج اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں بہت ممد ثابت ہوگا۔

احمد آباد میں ادبِ لطیف پر پابندی:۔ احمد آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک نوٹس کے ذریعے احمد آباد میں ادب لطیف کا داخلہ غیر معین عرصہ کے لئے داخلہ بند کر دیا ہے! چنانچہ جو لوگ 'ادب لطیف' کو منگوا کر فروخت کریں گے۔ ان کو قانونِ امن عامہ کے ماتحت گرفتار کر لیا جائیگا۔

اس اقدام کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ ہم سے پوشیدہ نہیں اور نہ پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ 'ادب لطیف' ترقی پسند رجحانات کو آگے بڑھا رہا ہے اور عوام کو ان کے رجحانات سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہی اس کا قصور ہے — یہی اس کا جرم ہے۔

ہم احمد آباد کے مجسٹریٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کا یہ تشدد انگیز رویہ ادب لطیف کی پالیسی پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ ادب لطیف جس راہ پر گامزن ہے۔ ہمیشہ اسی طرح گامزن رہے گا!

ادب لطیف کا افسانہ نمبر:۔ اکتوبر میں 'ادب لطیف' کا معرکۃ الآرا افسانہ نمبر شائع ہو رہا ہے۔ 'ادب لطیف' کی روایات شاہد ہیں کہ ادب لطیف کا ہر نمبر دنیائے ادب میں سنگِ میل ثابت ہوا ہے اور یہ افسانہ نمبر بھی ایک تاریخی کارنامے کی حیثیت اختیار کرے گا۔

انجمن ترقی پسند مصنّفینِ ہند کا اعلان نامہ

۲۷، ۲۸ اور ۲۹ مئی کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھیمڑی (بمبئی) میں منعقد ہوئی جہاں یہ اعلان نامہ متفقہ طور پر منظور ہوا۔

آج ہندوستانی ادب میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ آج ترقی پسند اور رجعت پسند رجحانات بہت زیادہ صفائی کے ساتھ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کش مکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو ہندوستان کی جنتا جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے لڑ رہی ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی عوامی جدوجہد نے ایک نیا رُخ بدلا۔ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ جو قومی تحریک کے زمانے میں بھی سامراج سے سمجھوتے کی کوشش میں برابر لگا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا اس کا ساجھی اور دوست بن گیا۔ اس سمجھوتے کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ہند کی حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ ہندوستانی جنتا کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے عوام ایک آزاد اور خود مختار عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

پچھلی لڑائی کو ختم ہوئے ابھی بہت دن نہیں ہوئے ایک دفعہ فاسزم کو شکست دینے کے بعد اب پھر دنیا کے عوام کو تیسری عالمگیر لڑائی کی نئی مجنونانہ تیاری میں لگایا جا رہا ہے اور ہندوستان کی جنتا کو بھی اس پھندے میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پچھلی لڑائی میں جمہوری طاقتوں نے سوویٹ یونین کی رہنمائی میں فاسزم کے خلاف جو فتح حاصل کی تھی۔ اسی کی وجہ سے امن، جمہوریت اور اشتراکیت کی تحریکوں نے بہت زور پکڑ لیا ہے۔ لیکن برطانوی اور امریکی سرمایہ دار جو اپنے منافع کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ بڑھانا چاہتے ہیں۔ اس بات کی سازش کر رہے ہیں کہ ڈالر اور ایٹم بم کے ذریعے ساری دنیا کو غلام بنائے رکھیں معاشی بحران بڑھ رہا ہے۔ عوام کا معیارِ زندگی گرتا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حیوانی لوٹ مار کے خلاف جنتا کی لڑائی بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔ ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں کا حکمران طبقہ ایک نئی لڑائی کی فضا تیار کر رہا ہے۔ سوویٹ یونین، پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے بارے میں تہمتیں تراش کر اور جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کے دماغوں کو لڑائی کے لئے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ سامراجی طاقتیں ملایا کے عوام کو دبانے کے لئے بری بربریت سے کام لے رہی ہیں۔ اور یہ مانڈونیشیا اور ویٹ نام میں مداخلت کر کے وہاں کے عوام کو آزادی حاصل کرنے سے باز رکھنا چاہتی ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ اور اس کی حکومت عوام پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ ہزاروں آدمی جن میں مزدور، کسان، ادیب اور فنکار سبھی شامل ہیں ہندوستانی قید خانوں میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ ان لوگوں کو قید کرنے سے پہلے رسمی طور پر عدالت کے سامنے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ کانگریسی حکومتیں ایک طرف لوٹ مار کرنے والے طبقے کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں، برطانوی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کے خلاف فوجی مرکز بنانے اور کامن ویلتھ کی زنجیروں کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی ہیں، عوام کی شہری آزادی اور ان کے جمہوری حقوق کو سلب کرتی ہیں، مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں اور دوسری طرف تہذیب و تمدن اور ادب کے بارے میں وہی رویہ اختیار رکھتی ہیں جو جرمنی اور اٹلی میں فاسسٹوں نے اختیار کیا تھا۔ مثلاً سوویٹ یونین کی فلموں پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ خود ہندوستان میں ترقی پسند فلموں کے بنانے میں طرح طرح کی روکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ لیکن امریکہ اور دوسرے پچھمی ملکوں سے آنے والی سڑی گلی غیر جمہوری فلموں کو دکھانے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر امن کی کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے پاسپورٹ چھین لئے جاتے ہیں اور ترقی پسند ملکوں سے تہذیبی اور سماجی تعلقات قائم کرنے کی ہر کوشش کو روکا جاتا ہے۔ یہ حکومتیں جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کر رہی ہیں۔ لیکن بدیسی ایجنسیوں اور ہندوستانی اجارہ داروں کو پوری آزادی ہے کہ وہ سب کو اپنے جال میں پھنسائے رکھیں اور غیر جمہوری پروپگنڈا کرتے رہیں۔

ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اظہار خیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ جمہوری رسالوں اور اخباروں کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کریں اور عوام کے ساتھ مل کر معیار زندگی کو بڑھانے اور تعلیم، تہذیب و تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیں۔

ہماری آزادی کی لڑائی کے اس نئے دور میں ادب کے اندر بھی دو رجحانات صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ ایکطرف وہ ادیب ہیں جو لڑائی اور سرمایہ دارانہ تشدد کی مخالفت کرتے ہیں، جو امن اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور جو پرانے ادب کی جمہوری روایات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو ہندوستان کو سامراجیوں کی غلامی میں رہنے دینا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ دار حکومتوں کے ظلم و ستم کو سراہتے ہیں، جو دنیا کی جمہوری طاقتوں کے خلاف طرح طرح کی تہمتیں تراشتے ہیں اور جو پرانے ادب کی بہترین روایات کو ابھرنے سے روکتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان کسی طرح کا سمجھوتہ ناممکن ہے۔ جو ادیب ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک تیسرا گروہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور رجعت پسند ادیبوں کی عوام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان کا حکمران طبقہ خاص قسم کے تصورات کو پیش کر کے بہت چالاکی کے ساتھ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ عوام کے دماغوں کو الجھن میں ڈال دے اور آج کے اصلی اور بنیادی سماجی مسئلوں سے ان کے دھیان کو موڑ دے۔ وہ ادیب جو سرمایہ داروں کے دست نگر ہیں "ادب برائے ادب" کا نعرہ بلند کرتے ہیں، ادب میں انفرادیت کو سراہتے ہیں اور ایسا ادب پیش کرتے ہیں جو عریانی، فحش اور سنسنی پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور اس طرح لوگوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اس طرح لوگوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ سوشلزم ادیب کی آزادی کو سلب کرتا ہے اور سوویٹ یونین میں ادیبوں کو کسی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ عوام کو فریب دینے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کی شان و شوکت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں طبقاتی کشمکش نہیں تھی اور اگر آج ہندوستان کے لوگ گزشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اہنسا کے راستے پر چلیں اور مختلف طبقوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں۔

ان سب مسائل کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کا نقطۂ نظر واضح ہے اور اس میں شک شبے کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب میں انفرادیت، اسلوب پرستی اور اسی طرح کے دوسرے رجعت پرست رجحانات سرمایہ دار اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کا ادب جو بظاہر سیاست سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ دراصل عوام کو نشہ پلا کر دھوکا دیتا ہے اور ان کے دماغوں کو الجھائے ہوئے رکھنا چاہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں جمہوریت پسند ادیبوں کو اظہار خیال کی آزادی نہیں ہے۔ سوویٹ یونین کے اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جاچکی ہے۔ کہ وہ عوام کو دبا سکیں، اسی لئے وہاں جمہوریت پسند ادیبوں کو پوری آزادی ہے اور سوویٹ یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیب ماضی کے کلچر اور ادب کے صحیح وارث ہیں اور وہ انسانی تہذیب کی بہترین روایات کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ سماج کے تاریخی ارتقا کے پس منظر میں وہ اپنے کلچرل ورثے کو تنقیدی نظر سے پرکھتے ہیں۔ وہ کلچر کو قومی تعصب اور تاریک اندیشی کا ہم معنی نہیں سمجھتے۔ وہ اس قسم کی تمام حرکتوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے ادب کو احیا پرستی کے رجحانات سے محفوظ رکھیں۔

ترقی پسند ادیب جانتے ہیں کہ ظالم و مظلوم میں سمجھوتہ نہیں ہوسکتا اور یہ کہ اس مسئلہ میں سچ اور اہنسا کی بات کرنا ایک ایسا پردہ ہے۔ جس کے پیچھے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی بربریت کو چھپانے کی کوشش کیجاتی ہے۔

اپنی تحریک کی ابتدا ہی سے ترقی پسند ادیب کہتے آئے ہیں کہ سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں کوئی سمجھوتہ بازی نہ ہونا چاہیئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی جدوجہد جنتا ہی چلاسکتی ہے۔ جب ۱۹۳۲ء میں سول نافرمانی کی تحریک ناکام ہوئی اور انگریزی راج کے سایے میں کانگریسی لیڈروں نے وزارتیں قبول کیں تو قومی لیڈروں کی پالیسی کے متعلق ہندوستانی جنتا کے بہت بڑے حصے کی خوش فہمیاں دور ہوئیں اور سامراج کے خلاف ڈٹ کر لڑنے کے لئے انہوں نے اپنی طبقاتی تنظیمیں بنائیں۔ سامراج سے کسی قسم کا معاہدہ یا سمجھوتہ بازی نہ کرنے کا جذبہ بہت عام ہوگیا اور اس کا عکس اس وقت کے ادب میں ملتا ہے اس خواہش نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں تنظیمی شکل پائی۔ سامراج کے خلاف جنگ میں ادب غیر جانبدار نہیں رہتا، مکمل آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد

ہیں اسے کامیابی کے ساتھ جنتا کی رہنمائی کرنی چاہیئے اور اس میں جوش پیدا کرنا چاہیئے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ جنتا کی خواہشوں اور امیدوں کو پیش کرے جنہیں صرف بیرونی سامراج ہی نہیں لوٹتا۔ بلکہ ہندوستانی سرمایہ دار، جاگیردار اور رجواڑے بھی لوٹتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مقاصد جنہوں نے نئے ترقی پسند ادب کی رہنمائی کی۔

اگر ہم پچھلے بیس سال کے ادب پر نظر ڈالیں تو بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اوروں کے مقابلے میں ترقی پسند ادیب ہی تھے جنہوں نے اپنے ادب میں ہماری تحریک آزادی کے نئے موڑوں کو پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے ان فاشسٹ طاقتوں کی جم کر مخالفت کی جو دنیا کو غلام بنانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے سوویت یونین کی جنتا کے ساتھ جو فاشزم کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اپنی رفاقت کا اظہار کیا، جاپانی فاشزم کے خلاف لڑتی ہوئی چینی جنتا سے دوستانہ رشتہ قائم کیا۔ اور مغربی سامراج کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک جو جدوجہد کر رہے ہیں ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے قحط کے زمانے میں بنگال کیلئے ہندوستان بھر کے لوگوں کو متحد کیا اور آزادی کی جنگ میں جس نے آگے چل کر ملاحوں کی شاندار بغاوت کا روپ اختیار کیا، انہوں نے ہندوستانی جنتا کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ ترقی پسند ادیب ہی ہیں۔ جنہوں نے عوامی اتحاد اور امن کا پرچم بلند کیا۔ جب کہ پورا سرمایہ دار پریس فرقہ دارانہ فساد کو بڑھانے اور پھیلانے میں عملی حصّہ لے رہا تھا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب میں خامیاں نہ ہوں اور ہم اسے اسی طرح آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جب ہم ان خامیوں کو سمجھیں اور دور کریں۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ترقی پسند ادب کی خاص کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے پورے طور پر عام جنتا سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ جس کی رہنمائی ہندوستان کا مزدور طبقہ کرتا ہے۔ اسی لئے ایسے تخلیقی ادب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی جھلک ہو۔ اسی لئے ادبی تنقید ان مختلف رجعت پرست رجحانات کو ختم نہ کر سکی۔ جنہوں نے صحت مند عوامی ادب کی ترقی میں رکاوٹ کا کام کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے کبھی کبھی رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتے بازی بھی کی اور ابھی تک خود ترقی پسند ادب پر کافی تنقید کو فروغ نہیں دیا جا سکا۔

ہندوستانی ادب کا مستقبل مزدور طبقے کی رہنمائی میں لڑتی ہوئی اس جنتا کے مستقبل سے الگ نہیں ہے۔ جو آج ایک آزاد زندگی، مکمل آزادی اور خود مختاری، جمہوریت اور سوشلزم کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اور جو انسانی لوٹ کھسوٹ کے تمام طریقوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ہمارے ادیب اس تحریک کے جتنا نزدیک آئیں گے۔ ان کے ادب میں صورت اور معنی دونوں اعتبار سے اسی حد تک گہرائی پیدا ہوگی۔

ادب کے رجعت پرست رجحانات جو عوام کے مفاد کی مخالفت کرتے ہیں۔ ختم ہو کر رہیں گے۔ صرف عوامی ادب ہی کا مستقبل روشن ہے۔ چاہے اس کی ترقی کی راہ میں آج کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں۔

کوئی ادب اس وقت تک عظیم نہیں ہو سکتا اور عوام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتا۔ جب تک کہ اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو۔ ترقی پسند ادب عظیم انسانی آدرشوں سے کسب نور کرے گا۔ جیسے امن سے محبت، قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش، انسان دوستی، جو جنگ اور انسانی لوٹ کھسوٹ کی مخالفت کرتی ہے۔ ادب کا یہ عظیم اخلاقی مقصد مطالبہ کرتا ہے۔ کہ تمام ادیب اپنی تحریروں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کریں، ان میں تاثر پیدا کریں، انہیں مقبول اور خوبصورت بنائیں۔ تاکہ ہماری جنتا ان سے محبت کر سکے، ان سے جوش حاصل کر سکے اور ان پر فخر کر سکے۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے۔ کہ یہ مستقبل معتبر ہاتھوں میں ہے۔

مخمور جالندھری

ڈالر امداد

اُدھر نہ دیکھو
اُدھر بُتِ حریّت کے ہاتھوں میں بزم آرا چراغ تو ہے
پہ جس کی تابانیاں سیہ فام حبشیوں کے گھروں میں اب تک رسا نہیں ہیں
اُدھر نہ دیکھو
کہ زر پرستوں کی حریّت زر پرست کی ملکیت رہی ہے
اُدھر نہ دیکھو
اُدھر ہمارے لہو کی بوندوں سے ہے چراغاں
سمیٹ کرلے گئے ہیں گالوں کی سُرخیاں، گرمیاں بدن کی
شباب کی تازگی، نظر کی شگفتگی، شوق کی جوانی
نچوڑ کرلے گئے ہیں رس، رنگ، راگ اور رقص زندگی کا
اُدھر نہ دیکھو
اُدھر تو چربی کی تہ پہ تہ چڑھ رہی ہے تن پر
اُٹھا رہے ہیں فلک رسا مسکنوں کی منزل پر اور منزل اک اور منزل!
کہ یہ غبار اتنا بڑھ چکا ہے کہیں بھی تل پھینکنے کو اب تو جگہ نہیں ہے
اُدھر نہ دیکھو
اُدھر اُٹھائی نگاہ جس نے پھر اُس نے اپنا پتہ نہ پایا

اُدھر نہ دیکھو
کہ اک درم کے عوض ہیں سیروں ہی ماس دینا پڑے گا تن پر
پھر اس پہ بھی کب ہوس کی آفاق دامنی اکتفا کرے گی

اُدھر نہ دیکھو
اِدھر ہی دیکھو
اِدھر کہ سینے ہیں چوڑے چکلے تنا وجن کا نظر رُبا ہے
بس ایک دھچکا — زمیں اُگل دے بہار، سرو سمن، شگوفے، نشاط و مستی
تمام کھیتوں کو لہلہادیں بلند فصلوں کی گو دمیں چھپے بسادیں
ہر ایک پُر سوز راہ پر سایہ دار اشجار جو لگا دیں
اِدھر ہی دیکھو
ادھر کہ بازو ہیں لمبے لمبے کساؤ تقدیر ساز ہے جن کی مچھلیوں کا،
بس ایک جھٹکا — ابھی ابھی زندگی کا سیلاب فیل پیکر کلوں میں دوڑے
برہنہ سینہ لپیٹ دیں جو ابھی ابھی مخملیں قبائیں
ابھی ابھی جو کھلے ہوئے سر پہ ڈال دیں ریشمی دوپٹہ
پلک جھپکتے محل اُٹھا دیں
اُدھر نہ دیکھو
اِدھر ہی دیکھو
ادھر ہی پھیلاؤ اپنا دامن
کہ چھین کر تند و تیز جبڑوں سے لا رہے ہیں یہی تو واپس
لہو کی گرمی، شگفتگی دل کی، آرزو کی بھری جوانی،

پ

حسن طاہر

مُلاقات

بچھڑ چکے تھے ہم اک دُوسرے سے آج ہمیں
اک ایسی صورتِ حالات نے ملایا ہے
ہوا ہے جنگ کے میداں میں سامنا اپنا
یہ روزِ بد بھی ہمیں وقت نے دکھایا ہے

مرے رفیق! مقابل ہیں آج ہم دونو
تجھے ترے مجھے میرے وطن نے بھیجا ہے
مگر یہ جنگ لڑی جا رہی ہے کس کیلئے
کچھ اس میں فائدہ میرا ہے اور نہ تیرا ہے

میں اپنے ذہن میں اک خلفشار پاتا ہوں
میں سوچتا ہوں یہ قربانیاں ہیں کس کے لئے
ہمیں تو ملتے ہیں چند ایک دھات کے ٹکڑے
ہمارے خوں کی یہ ارزانیاں ہیں کس کے لئے

جُدا کیا تھا ہمیں جس فریبِ فردا نے
حقیقت اُس کی ہمیں ہو چکی ہے اب معلوم
خوشی ہی آئی نہ دکھ ہی ہمارے دُور ہوئے
ہم آج بھی ہیں اُسی طرح بے کس و مظلوم

یہ دمدموں کی تگ و دو یہ سیلِ آتش و خُوں
فسانے کہتے ہیں مجبُورِ آدمیت کے
کبھی نہ سمجھیں گے اک دوسرے کو ہم انساں؟
کبھی نہ ٹوٹ سکیں گے یہ بُت حمیت کے؟

یہ ٹینک اور یہ طیارے، گولیاں اور بم
گھروں کو، کھیتوں کو ویران کر کے دم لیں گے
بڑھاؤ ہاتھ کہ دشمن کو پا گئے ہیں ہم
لڑانے والوں سے اب انتقام ہم لیں گے

شریف کنجاہی

برکھا

آج برکھا ہوئی

آج صحنِ چمن

آج میدان - بن - سب ہیں نکھرے ہوئے

آج دہقان کتنے ہی دھندوں سے آزاد ہے

یوں تو ہر "کم معاش" آج دلشاد ہے

آج پھوٹی ہے امید کی وہ کرن

جس سے فاقوں کی تاریکیاں اور اندھیارے

ہوں گے ہرن

آج گل کار کے بھاگ پھوٹے مگر

اس کا آوے کا آوا اب اک گیلی مٹی کا انبار ہے

اس کی محنت گئی

اس کی دولت گئی

اور چھوٹے بڑے گھر کے افراد کے چھوٹے "دوزخِ شکم"

ان کو ہر حال ایندھن تو درکار ہے

آج برکھا ہوئی

آج بنجر زمینوں کو بھی مخملیں گھاس کی آس ہے

آج مزدور کے "خانۂ انوری" میں اداسی ہے اور یاس ہے

آج اس کی مشقت کا پرساں نہ کوئی خریدار ہے

اور بنیے سے آٹا بھی دشوار ہے

اس کا کتنے دنوں سے وہ مقروض ہے

آج برکھا ہوئی

وقت کی چیز تھی

اور بے وقت ہو تو بھی اپنی خطا؟

لیکن اس کا صلہ ——

کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے

آؤ سوچیں کوئی مل کے تدبیر ہم

جس سے آئندہ نسلیں تو یوں کم سے کم

پائمال و پریشاں نہ ہوتی رہیں

سلام (مچھلی شہری)

ایک خط

بتاؤ دوست!
تمہیں خط لکھوں کہ آج کے دن
تمہارے جذبۂ اخلاص پر چڑھانے کو
پھر اُس حسین گلستاں کے رنگ اُڑا لاؤں
کبھی جسے مری تخئیل نے سنوارا تھا

— وہ ابتدائے محبت، وہ خواب ہائے نشاط
وہ ایک گاؤں، وہ پیپل کی چھاؤں جس کے تلے
کسی نے کرشن کی رادھا کا رُوپ دھارا تھا!

— وہ میری دوسری اُلفت، وہ مال روڈ کی رات
وہ ایک شوخ سی تتلی، وہ شام جبکہ مجھے
خدا نے اپنا عدوِ جان کا پکارا تھا!

— یہ میری تیسری چاہت، یہ ایک راز کی بات
یہ اک حسینہ، یہ گھڑیاں؛ اب آگے کون کہے
جو اہلِ دل ہو تو کافی یہی اشارہ ہے!
عزیز دوست! تمہارے لئے میں کیا لاؤں
مرا خیال تھا اک تازہ نظم بھیجوں گا۔
مرا یہ حال ہے جیسے کہ مجھ میں جان نہیں

— شراب ایک بہانہ ہے پی کے آیا ہوں
اجل اب آئے، میں دو لمحے جی کے آیا ہوں
گماں یہ ہے کہ ایسے میں شعر لکھ لوں گا
مگر پرندِ تخئیل میں اب اڑان نہیں!

— تو بات یہ ہے کہ یہ لکھنؤ جہاں سے تمہیں
میں لکھ رہا ہوں بڑے شوق سے یہ چند سطور
زفیضِ عالمِ تغیّر ایک گلشن ہے
بدل رہے ہیں گُل و لالہ میں جہاں ناسور—!

— عجیب بات ہے اس تازہ تر گلستاں میں
مجھے خزاں کی وہ انگڑائی یاد آتی ہے
جب ایک پھول نے دم توڑ کر پکارا تھا:
— "ذرا مصنفۂ شامِ لکھنؤ سے کہو
کوئی فسانہ نہیں اب ستاروں سے آگے
اُداس، اُداس فضاؤں میں موت رقصاں ہے
وہاں، حیات نہیں ہے چناروں سے آگے!"

— ستمگار خانۂ شامِ اودھ کے داماں میں
بہار آئے تو مرجھا کے لوٹ جاتی ہے

ستاروں سے بھی پرے صرف اک نظارا تھا!"

— مرا قصور کہ اس بزمِ نغمہ بار میں بھی
مرا قصور کہ اس صُبحِ زرنگار میں بھی
مرا قصور کہ اس عالمِ بہار میں بھی
قدم جو سُوئے گلستاں بڑھا نہیں سکتا
جو ایسے میں خلشِ دل چھپا نہیں سکتا
جو سازِ نو پہ کوئی گیت گا نہیں سکتا

— "وہ ایک گاؤں، وہ پیپل کی چھاؤں جس کے تلے
میں اپنے خواب کا رنگیں محل بناتا تھا
وہاں ندی سے ذرا فاصلے پہ اک مسجد
وہاں ندی کے کنارے بڑا سا مندر ہے
مری بہن کی سہیلی، لتا کی شادی تھی
وہیں جہاں پہ ہمارے رمیش کا گھر ہے!
— مری نظر میں ہیں اب تک وہ گاؤں کے لڑکے
میں جن کو نغمۂ حُبِّ وطن سناتا تھا
— اب آج جبکہ مرا خواب کامیاب بھی ہے
مرے ہمالہ کے ماتھے پہ آفتاب بھی ہے
عزیز مادرِ گنگ و جمن میں آب بھی ہے
— میں اپنے گاؤں میں جاؤں تو لوٹ آتا ہوں
میں مال روڈ سے گزروں تو جھینپ جاتا ہوں
میں زیرِ پرچمِ زریں بھی تھرتھراتا ہوں
عزیز دوست! یہ میرا قصور ہے ورنہ

نگار خانۂ شامِ اودھ کے آئینے
ہزار حسنِ رُخِ مہر و ماہ در آغوش
ہزار جلوۂ قلب و نگاہ در آغوش
ہزار دعوتِ ذوقِ گناہ در آغوش
خود اپنا شیشۂ دل چُور چُور ہے ورنہ
مجھے بھی ایک حسینہ کی دلربائی نے
کنارِ گومتی ہنستے ہوئے پکارا تھا:
— "پھر آپ بھی تو ترقی پسند شاعر ہیں
تو آپ لوگ ادب میں حیات ڈھونڈتے ہیں
سُہانی شب ہے، گل و نسترن کی بات کریں
"محل" کے پاس غریبوں کی رات ڈھونڈتے ہیں؟!
— اُجالی رات میں خاموش مال روڈ اے دوست!
کسی چڑیل کی صورت ہنسی اڑانے لگی
اور اس چڑیل کے بے رحم قہقہے گویا
عجیب طرح سے ٹکرا کے "چھتر منزل" سے
مرے اُجاڑ سے مسکن میں مجھ کو چھوڑ آئے!
— یہاں سے بھی تو وہ مدہوش مال روڈ اب تک
مرے دریچے سے رہ رہ کے مسکرانے لگی!
سویرا ہونے لگا چار بجنے والے ہیں
دُھواں بھی اُٹھنے لگا ہے چراغ کے دل سے
اجل سمیٹ کے آئی ہے موت کے سائے!
اور اس سے پہلے کہ بے رحم صبح کی ناگن
شفق کے سُرخ لبادے میں چھپ کے آجائے
بہت خلوص سے میں کر رہا ہوں تم کو سلام —!

فارغ بخاری

تشنگی

کتنی مسرور تھی امید کی دولت پا کر
شادمانی کے کنول آنکھوں میں لہراتے رہے
رقص کرتا ہوا ماحول بنایا تو نے
مسکراتی ہوئی دنیا کے خیال آتے رہے
خود فریبی نے تصور کے حسیں جال بنے
جو تیری فطرتِ احساس کو بہلاتے رہے

تو نے بڑھتے ہوئے سایوں سے پناہیں مانگیں
ایک آوارہ کرن کو بھی غنیمت جانا
غم و اندوہ کی تعبیر شکن دنیا میں
جھوٹے وعدوں کے چمن کو بھی غنیمت جانا
ہر طرف یاس کی تاریک گھپائیں پا کر
فرصتِ چشم زدن کو بھی غنیمت جانا

اپنی معصوم دعاؤں کی یہ تاثیر بھی دیکھ
اب ترے درد کی تکمیل ہوا چاہتی ہے
گھٹ کے رہ جائیں بہاروں کے ترانے جن میں
ایسے زندانوں کی تشکیل ہوا چاہتی ہے
جس کرن کو تری نظروں نے سہارا سمجھا
وہ بھی اب سایوں میں تحلیل ہوا چاہتی ہے

وہ ارادے جو امنگوں کے نگہبان رہے
آج خود بیکس و لاچار نظر آتے ہیں
لہلہاتے تھے جو کل شانِ دلآویزی سے
آج وہ پھول بھی بیمار نظر آتے ہیں
تو تو افلاس سے بھاگ آئی تھی لیکن اب تو
ہر طرف قحط کے آثار نظر آتے ہیں

نریش کمار شاد

اجنبی

محترم خاتون مجھ کو دیکھتے ہی یک بیک
کس لئے تیرے رُخِ شاداب کی تنویر پر
میں انہیں اجداد کا فرزند ہوں جن کا لہو
سینچتے آئے جوابِ تک تیرا گلزارِ طرب
خوف کھا مجھ سے کہ اب میرے خیالوں کی لپک
گڑگڑاتا ہے جو تیری بےبصر نظروں سے دُور
اپنی آنکھوں میں لئے نفرت کا زہریلا غبار
سیم و زر کی چاردیواری سے باہر جا کے دیکھ
دیکھ ابھر کر اپنے کجلائے ہوئے ماحول سے
زرد چہروں پر دہکتے عزم کی رخشندگی
وسعتِ کون و مکاں کی تلملاتی روح میں
پھُوٹنے کو ہیں بطونِ شب کے انوارِ سحر
اب زیادہ دیر تک انساں کی عظمت کا جمال
آقا و بندہ کا یہ بیمار و کہنہ امتیاز
یہ حقارت جس کو پالا ہے تیری تہذیب نے

کیوں دہک اُٹھی ہیں تیرے حُسن کی رعنائیاں
چھا گئی ہیں جذبۂ تحقیر کی پرچھائیاں
جل رہا ہے تیرے گھر کے قمقموں کے روپ میں
حادثاتِ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
توڑ سکتی ہے ترے خونی تمدّن کے ستون
میں اسی طوفانِ ہیبتناک کی اِک لہر ہوں
دیکھتی کیا ہے مرے یہ جھنجھڑے اے سیم پوش
بھوک کی ماری ہوئی جانوں کا طوفانی خروش
میرے جیسے ان گنت محنت کشوں کے کارواں
خشک آنکھوں میں بغاوت کی لپکتی بجلیاں
گونجتے ہیں انقلابِ نو کی شہنائی کے راگ
محترم خاتون اپنے عنبریں خوابوں سے جاگ
لٹ نہیں سکتا حصارِ نخوت و جبروت میں
مر کے سج جانے کو ہے تاریخ کے تابوت میں
وقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہ جائے گی

قہقہے ماریں گے صدیوں کے فسردہ ولولے
تیری آبائی رعونت دیکھتی رہ جائے گی

جعفر طاہر

طاعتِ آبادِ جہاں کے اُس طرف
وسعتِ کون و مکاں کے اُس طرف
زندگی کے ہونکتے شعلوں سے دُور
خوابگوں تنہائیوں کی گود میں
دیکھتا ہوں، گوش بر آوازہیں
شبنمی سائے، لہکتے آبشار
بہرِ تشریفِ قدومِ عاشقاں
دست بر سینہ، سراپا انتظار
اللہ اللہ وعدۂ صبحِ ظہور
مژدۂ صبر و سکوں، نور و سرور
نقطۂ بے مثل پرکارِ وجود
غنچۂ سرسبدِ گلزارِ شہود
روح کی جاگیر، انعامِ شباب
رقِ منشورِ خداوندِ بہار
انتظار و انتظار و انتظار

دیکھتی ہو اُشترانِ بار بر
جھنجھناتی جھانجنوں کے ساز پر
زیرِ لب کچھ سرگمیں گاتے ہوئے
ریت کے سینے پہ اٹھلاتے ہوئے
زندگی کے جادۂ پرخار پر

ہمّتوں کے پھول برساتے ہوئے
آنکھ میچے جا رہے ہیں تیز تیز
اور یوں ہی چاند تارے بے حساب:
مشتری، مریخ، زہرہ آفتاب
نیلگوں پہنائیوں میں روز و شب
ایک مدت سے ہیں سرگرمِ سفر
گاڑ کر قطبِ تمنا پر نظر
قدسیوں کی محفلوں سے دُور دُور
صندلیں بانہوں کے خم سے بے نیاز
قرب کی موہوم امیدوں سے پاک

ہائے دُولابِ ازل کی گردشیں
دُوریوں کی ذوق ساماں لذتیں
قُرب، ذوقِ آرزو کا اختتام
قُرب، امیدوں کی ارمانوں کی موت
قُرب، شاعر کی اڑانوں کی تھکن
کتنے احساسات کی مرگِ دوام

بُعد کی رنگینیاں لیکن نہ پوچھ
حضرتِ یزداں کا یہ جاہ و جلال
یہ فرشتوں کا طلسمی طمطراق

مغبچے، ساقی، بتانِ سیم ساق
مُسند تسی تکیے، سنہری مسندیں
اور بھی تیرے خدا کی جدتیں
بُعد کی مرہونِ منت ہی تو ہیں
مثلِ چشمِ کوثریں مینا و جام
صورتِ ماہِ شکستہ ہر سبُو
کاش اتنا جانتی اے کاش تُو
مے بھلا اِن آبگینوں میں کہاں
بُعد کا لیکن چھلکتا ہے لہو

وہ طرب گاہیں — طلائے ناب کے
نقرۂ نایاب کے رخشاں محل
کاخ نیلم کے زمرّد کے مکاں
دُرفشاں محراب و در میزابؔ و بام
مرمریں ایواں، طرازیدہ ستوں
مخمل و دیباج و اطلس کے فروش
جن پہ رقصاں خلد کی شہزادیاں
برہنہ کولہوں کو مٹکاتی ہوئی
گت پہ زنگولوں کی لہراتی ہوئی
بسیر آہنگانِ جنت نغمہ خواں
محوِ خدمت لولیانِ سفتہ گوش
جھوم اُٹھتے ہیں جوانانِ ارم
گونجتا ہے نعرہ اللہ ھو

سدرہ و زیتون کی شاخوں تلے
جلتی ہیں صف بر صف لیٹے ہوئے
سیمگوں سینوں پہ لب رکھے ہوئے
ریشمیں خاموشیوں کی چھاؤں میں
ناچتی ہیں نرم رو سرگوشیاں
رُوح کی مدہوش کُن موسیقیاں
صبح کی دھندلی فضا میں جس طرح
لب کُشا ہونے لگیں شہنائیاں
اللہ اللہ اذنِ وصل و اختلاط
بازوؤں میں نوجواں حوریں لیے
دے رہے ہیں پارسا دادِ نشاط
دیکھتا ہے، مسکراتا ہے خدا
اور لحظہ بعد پھر وہ ہاؤ ہُو
نعرۂ اللہ ھو، اللہ ھو

آج کی شب تو بھی ہوتی دُور کاش
اور میں اِک سچے مومن کی طرح
دیکھتا رہتا سدا جنّت کے خواب
سوچتا رہتا تصوّف کے نُکات
قرب کی اس دعوتِ بے کیف پر
خون روتی ہے کنواری چاندنی
بجھ گئی فکر و نظر کی روشنی
سینۂ ہستی میں پیدا ارتعاش
بربطِ ہستی شکستہ پاش پاش
آج کی شب ایک پُر اسرار قتل —
اِک جواں شاعر کی پیش از وقت موت —
"سیج" اک جھکا ہوا زرّیں کفن —
پھول دھبے خون کے جلتے ہوئے

باقر مہدی

کارواں

منتشر راہوں پہ رکتے راہرو بھٹکے ہوئے — قافلہ سالار کے وعدوں میں آکر رہ گئے
ان سنہری منزلوں کا خواب دیکھا تھا مگر — ریگ زاروں میں بڑی ہمت سے جا کر رہ گئے
چیختی چلتی رہی ہر سمت سے بادِ سموم — یہ خزاں میں فصلِ گل کے گیت گا کر رہ گئے

لٹ رہا ہے کارواں خود رہنما کے ہاتھ سے — قافلوں کو عشق کی منزل پہ اب لائے گا کون؟
آرزوؤں کے حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں — زندگانی کے حقائق آج سمجھائے گا کون؟
جن کی محفل میں شرابِ عشق ہی سے جان تھی — ان کی محفل سے لہو کا جام لے جائے گا کون؟
جن کے گلشن میں محبت کے ترانے جرم ہوں — ان کے گلشن میں شکستہ ساز پر گائے گا کون؟
جن کا مسلک رہبری تھا، ان کا مقصد رہزنی — ایسے میر کارواں کے ساتھ اب جائے گا کون؟
جب طلسمِ رہبری ٹوٹا تو ہوش آ ہی گیا — ریگ زاروں میں بگولوں کا خیال آ ہی گیا
عالمِ وحشت میں سودائے محبت بڑھ گیا — جیسے منزل کا خیال اک بار تڑپا ہی گیا

یہ شکستہ دل مسافر سوئے منزل چل پڑے — نامرادوں کا نیا اک کارواں بنتا گیا
ان کی آنکھوں میں محبت کی چمک رقصاں رہی — زخمِ دل رہ رہ کے نقشِ جاوداں بنتا گیا

قافلے جوشِ جنوں میں سوئے منزل ہیں رواں — جیسے خوابیدہ سی راہوں میں نئی جان آ گئی
جیسے ویرانوں پہ اک رنگیں گھٹا سی چھا گئی — جیسے دیوانوں کو کوئی یاد پھر تڑپا گئی

(انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ میں پڑھی گئی)

خاطر غزنوی

خانہ بدوش

زندگی رقص میں ہے، رقص حسیں کرنوں کا ۔۔۔ نقرئی نغمے ہیں شب تاب فضاؤں پہ محیط
شہر سے دور، جنوں زارِ محبت کے قریب ۔۔۔ چند خیموں میں سمٹ آئی ہے دُنیائے بسیط

مسکراہٹ کے ہر اک سمت ہیں پرچم پرّاں ۔۔۔ قہقہے بہکی فضاؤں میں ہیں رقصاں رقصاں
دودھیا چہروں پہ ہے کیف کا عالم طاری ۔۔۔ غم کہیں دور چھپا بیٹھا ہے مضطر، حیراں

ہر الاؤ پہ ہے آزاد ترانوں کا ہجوم ۔۔۔ سرد نغمے بھی یہاں آ کے پگھل جاتے ہیں
اور ان گیتوں کی آزاد دھنوں میں گھل کر ۔۔۔ اسی ماحول کی رنگینی میں ڈھل جاتے ہیں

ہر نئی صبح کو رہ جاتے ہیں کچھ راکھ کے ڈھیر ۔۔۔ دور اڑتا ہے کہیں کشمکشِ نو کا غبار
ہر پڑاؤ پہ انہیں کرتی ہے رخصت آ کر ۔۔۔ نئے جذبوں کی مہکتی ہوئی زرکار پھوار

زندگی ایک چھناکا ہے، پری زادوں کا ۔۔۔ کون اڑتے ہوئے نغمات کو محبوس کرے
کون بہتی ہوئی آوارہ کرن کو روکے
کون آزاد کو زندانوں سے مانوس کرے

ظہور نظر

آڑ

(ڈان، سندھ ابزرور اور دوسرے اخبارات کے اُن اداریوں کے جواب میں جو ادب پر احتساب عائد کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں)

میں جانتا ہوں
میں خوب پہچانتا ہوں
اور صرف میں نہیں ـــ
زندگی کو آزاد اور خوشحال دیکھنے کی تڑپ میں
مر مر کے جینے والا ہر ایک انسان جانتا ہے
کہ یہ جو فرسودگی کے پیغامبر فحاشی کی آڑ لے کر
تمام ادب کو اسیر کرنے کے مشورے دے رہے حکامِ ملکِ نو کو
یہ کون ہیں
کس گروہ کے کاسہ لیس ہیں
اور آج تک ان کا فعل و کردار کیا رہا ہے

یہ وہ ہیں جنکی رگوں میں اوروں کی محنتیں لہر کھا رہی ہیں
یہ وہ ہیں جن کے طفیل انسانیت کی معصوم و پاک قدریں
درندگی اور موت کا زہر پی رہی ہیں
یہ وہ ہیں جنکی زباں کو انسان، کے خون کی چاٹ پڑ گئی ہے
یہ وہ ہیں جن کی نگاہ و خونیں
حیات کے مٹیلی اصولوں پہ گڑ گئی ہے
یہ اُن کے مہرے ہیں اُن کے ایجنٹ ہیں کہ جو
حفظِ زندگی اور امن و انصاف کی حفاظت کا نام لے کر
حیات کے گرد گاڑ دیتے ہیں کالے قانون کی سلاخیں

مرے رفیقو!
مرے جواں اور حوصلہ مند ساتھیو!!
زندگی کو آزاد اور خوشحال دیکھنے کی تڑپ میں مر مر کے جینے والو!!!
ادب پہ یہ احتساب بھی اک سلاخ ہے
جس کو آدمیت کے نرم سینے میں گاڑنے کی غلیظ تجویز ہو رہی ہے
اور اس کا باعث یہ ہے کہ اب ہم
ادب میں اُن آہنی سلاخوں کو توڑ دینے کا صاف اظہار کر رہے
جو زندگی کے چہار جانب گڑی ہوئی ہیں ـــ"

ہم اپنے افسانوں، اپنے گیتوں میں

سبز کھیتوں سنہرے خوشوں کو لوٹنے والے چور جاگیردار کا پول کھولتے ہیں

ہم اپنے مضمون اپنی نظموں میں

بھولے بھالے کسان اور سیدھے سادھے مزدور کو بتلاتے ہیں اس کا رستہ

کہ جس پہ چل کر وُہ زندگی کی تمام خوشیوں کو پا سکے گا

ہرے بھرے لہلہانے والے حسین کھیتوں کو دیکھ کر مسکرا سکے گا

سنہرے خوشوں کے بوجھ سے جھکتی ڈالیاں اُس کی اپنی ہونگی

حسین و خوشرنگ دھان کی سبز کھیتیاں اُس کی اپنی ہوں گی

زمین محنت کشوں کی ہوگی اناج محنت کشوں کا ہوگا

ملوں پہ کانوں پہ کارخانوں پہ راج محنت کشوں کا ہوگا

ادب ہمارا رفیق ہے

جس کو ہم کبھی قہقہوں کبھی آنسوؤں کا خوں دیکے پالتے ہیں

ادب ہمارا ضمیر ہے

جس کو خود بخود وقت اور حالات اپنے سانچوں میں ڈھالتے ہیں

ادب ہمارا دماغ ہے قلب ہے نظر ہے

ادب ہماری حیات کا عکس ہے تقاضا ہے راہبر ہے

ادب پہ یہ اختساب در اصل اختسابِ حیاتِ نو ہے

جسے فحاشی کی آڑ لیکر اسیر کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں

وُہ مہرِ انسانیت کی ضو ہے

مرے رفیقو!

مرے جواں اور حوصلہ مند ساتھیو!!

زندگی کو خوشحال اور آزاد دیکھنے کی تڑپ میں مر مر کے جینے والو!

بڑھو!— بڑھو—!!

اور بڑھ کے فاشزم کی طرف جانے والے فرسودگی کے جیالہ گروں سے کہدو

کہ آفتابِ حیاتِ نو کی حسین اور احمریں شعاعوں پہ

اب کوئی تیرگی مسلط نہ ہو سکے گی —

سورج اور تارے

جگن ناتھ آزاد

نئے خورشید سے یوں ڈوبتے تاروں نے کہا
ہم بہت چمکے مگر تیری ضیا کم نہ ہوئی

ہم نے مل جل کے بہت زور لگایا لیکن
زلفِ پُرنور تری ہم سے تو برہم نہ ہوئی

مُسکراتے ہوئے سورج نے دیا ان کو جواب
جنگ مجھ سے نہ کرو میرے مقابل نہ تنو

دورِ پُرنور میں جینے کی تمنّا ہے اگر
مرے انوار میں گم ہوکے مرا جزو بنو

احمد فراز

اعتراف

مضحکہ خیز تھے کس درجہ خیالات مرے
تجھ سے کہتا تھا کہ پابند فضاؤں سے نکل
پھاند کر دولت و سرمایہ کی دیواروں کو
بھوک، افلاس کے آزاد بیابانوں پر
اپنی پابند بہشتوں کو نچھاور کر دے
وقت آیا ہے زمانے سے بغاوت کر دے

میں مگر عقل کا اندھا تھا مجھے کیا معلوم
ٹوٹ بھی جائے زر و سیم کی دیوار اگر
کٹ بھی جائیں ترے پاؤں کی گراں زنجیریں
کھل بھی جائے جو کبھی آہنی زنداں کا در
تجھ کو پھر ایک قفس دوست پرندے کی طرح
اسی مانوس کٹہرے میں چلا جانا ہے
کہ تجھے جرأتِ پرواز نہیں ہو سکتی —
— اور اس طوقِ طلا رنگ کی جھنکاروں سے
جسم تو جسم تری روح بھی آزاد نہیں

ٹھیک ہے تو نے جو سمجھا تھا بجا سمجھا تھا
کہ میں نادان ہوں دیوانہ ہوں سودائی ہوں
مصلحت کوش نہیں میری جنونی باتیں

عزیز الحق

دو نظمیں (۲)

(۱)

غمِ دوراں کے ستائے ہوئے انسانوں کو
پیار کرنے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی
کالی تقدیر کے لکھے ہوئے افسانوں کو
چند کرنوں کی سہولت بھی نہیں مل سکتی
خواب لہراتے رہیں بھیگی ہوئی پلکوں پر
سانس چلتی رہے آہوں کا تسلسل بن کر
"آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز"

(۲)

سرسراتے ہیں ہیولے لاکھوں
ذہنِ مفلس کے صنم خانوں میں
رقص کرتے ہیں بگولے لاکھوں
میری تقدیر کے ویرانوں میں
دور آکاش کے اس پار کہیں
لوگ کہتے ہیں خدا رہتا ہے
اور انکار نہیں ہو سکتا

ٹمپل روڈ

قتیل شفائی

(لاہور کی ایک پورٹریٹ)

رنگ رنگیلے محل دو محلے جگمگ جگمگ جاگ رہے ہیں
ان محلوں میں رہنے والے میٹھی نیندیں تیاگ رہے ہیں

ایک محل کا جھوم جھما کر ڈگمگ ڈگمگ ڈول رہا ہے!
جس میں اک سونے کا پنچھی اڑنے کو پر تول رہا ہے

ایک حویلی چھنن چھنن چھن پائل گت پر ناچ رہی ہے
موتی چگنے والی چڑیا جس کی چھت پر ناچ رہی ہے

ایک جھروکہ سانسوں کے گرمیلے پن سے ہانپ رہا ہے
جس کے پائیں باغ کا منظر اپنا چہرہ ڈھانپ رہا ہے

ایک دریچہ روشنیوں کے فوارے سے چھوڑ رہا ہے
جس کے بہتے سائیوں میں اک پردیسی دم توڑ رہا ہے

رات کی چلتی گاڑی کے چمکیلے پہیے بھاگ رہے ہیں
رنگ رنگیلے محل دو محلے جگمگ جگمگ جاگ رہے ہیں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

تنقیدی جھلکیاں

ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کیلئے یہ بڑا نازک وقت ہے. کیونکہ خود زندگی کا قافلہ اس وقت پُرخار راہوں سے گزر رہا ہے۔ یہ زمانہ ہی پُرآشوب ہے، لیکن یہ صورت حال حیرت انگیز اور تعجب خیز نہیں، کیونکہ ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج ان حالات سے برابر دوچار ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ وہ تو اسی کشمکش کی ایک کہانی ہیں — زندگی کے ابتدائی دور سے لیکر اس وقت تک انہیں ایسی ایسی کٹھن منزلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، جن سے ان کی روح زخمی ہوگئی ہے، لیکن ان کے قدم ڈگمگائے نہیں ہیں. بلکہ وہ اس بھٹی میں تپ کر کندن بنکر نکلے ہیں — اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انسانی زندگی کی تاریخ خیر و شر، نیکی و بدی انسانیت در ندگی کی باہمی کشمکش کی ایک مستقل اور مسلسل داستان ہے۔ اور ادب چونکہ تہذیب اور ثقافت کلچر اور سماج، زندگی اور انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے، اس لئے اس کشمکش کے اثرات سب سے زیادہ اسی کے اندر نمایاں ہوتے ہیں۔

پروہت کال سے لے کر سامنت کال، جاگیرداری، فسطائیت اور سرمایہ داری تک ہر زمانے میں برسر اقتدار طبقے نے ادب کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی ہے، تاکہ ادب ایک مضبوط ہتھیار بن کر ان کے خلاف صف آرا نہ ہوجائے۔ کہیں کہیں ادب ان کے جنگل میں پھنس بھی گیا ہے۔ اور اس نے ان کے نظریات کے پرچار میں کسی حد تک مدد بھی کی ہے، لیکن اسی زمانے میں صحت مند ادب کے علمبرداروں نے ایسے ادب کے خلاف محاذ بھی بنایا ہے۔ اور شر کی قوتوں کو شکست دینے کی کوشش بھی کی ہے — خصوصاً یہ صورت حال اس وقت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ جب ادب کی تخلیق کرنیوالوں میں سماجی شعور بیدار ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ادب میں یہ کشمکش بھی اسی وقت سے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پروہت کال کے ادب میں مذہبی جاگیرداری کی برتری کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن انسانیت کا خیال بھی پس پشت نہیں ڈالا گیا ہے. سامنت کال کا ادب ملکی اجارہ داری کا ترجمان ہے، لیکن انسانی قدروں کو یہاں بھی بالکل نظرانداز نہیں کیا گیا ہے. فسطائیت نے اپنے زہریلے جراثیم پھیلانے کے لئے ادب کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ اور ایک حد تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن جمہوریت کے علمبردار اور انسانیت کے پرستار اس کی شرانگیزی کو بے نقاب کرنے سے باز نہیں آئے — اور انہوں نے اس تاریکی میں بھی اقدار خیر کے نور سے دنیا کو منور رکھا. حالانکہ اس سلسلے میں قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ جلاوطنی کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑے۔ لیکن چونکہ انسانیت کی قدریں انہیں عزیز تھیں، اسلئے انہوں نے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہٹلر اور اس کے مشیران کار نے ٹامس ہاٹن رش من، ارنسٹ ٹالر، لین فینشو ینگ، الڈگ رین، جیکب ولیسرمان، ردم لینڈاو، والٹر مہرنگ اور کارل زوشمیر وغیرہ کو کیسی کیسی تکلیفیں پہونچائیں، لیکن انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی نازی اصولوں کے پرچار کو گوارا نہ کیا — آج وہ زندہ ہیں، ان کے اصول زندہ ہیں — زمانے نے ہٹلر اور اس کے فسطائی اصولوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے — اور فسطائیت کے بعد آج سرمایہ دارانہ آمریت اپنی بدترین شکل میں دنیا پر چھا جانے کے منصوبے باندھ رہی ہے۔ چنانچہ اسکی بھی آج یہ خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادیب اور فنکار اس کے اصولوں کی نشر و اشاعت کے لئے اپنی تخلیقات کو وقف کردیں۔ بعض ایسا کرنے کے لئے تیار بھی ہوگئے ہیں، لیکن جنہوں نے اس کی اصلیت کو سمجھ لیا ہے، وہ ایک پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہیں — اور ان اصولوں کو عام

کرنے میں پیش پیش ہیں، جس سے انسانیت کو سرمایہ دارانہ آمریت کے "دیوِ استبداد" سے نجات مل سکتی ہے۔ حالانکہ انہیں اس سلسلے میں بڑی ہی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کیلئے اس وقت قید و بند کی سختیاں بھی ہیں، حکمران طبقے کی خود ساختہ عدالتیں بھی ہیں، پھانسی کے تختے بھی ہیں گولیوں کی بوچھاڑیں بھی ہیں — غرض یہ کہ ایذا رسانی اور تباہ و برباد کرنے کے کون سے ذرائع ہیں، جن کو انسانی قدروں کے علمبرداروں کے خلاف استعمال نہیں کیا جا رہا ہے — لیکن کیا انسانیت کی آواز اس طرح دب سکتی ہے؟ — تاریخ بتاتی ہے کہ آج تک تو ایسا ہو نہیں سکا — وہ تو خیر و شر کی آویزش کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کو دبانا اتنا آسان نہیں—

جو کچھ آج ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ یہ ساری مصیبتیں انسانیت کا بول بالا کرنے کے سلسلے میں اٹھائی جا رہی ہیں — اس سے حق کی فتح کے لئے زمین تیار ہو گی۔ انسان جبر و استبداد کے پنجوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا — اور اس طرح اس کو دائمی خوشی نصیب ہو گی۔

انسانیت کے علمبرداروں کے خلاف آگ اور خون کا یہ کھیل خصوصیت کے ساتھ آجکل امریکہ میں کھیلا جا رہا ہے۔ کیونکہ امریکی سیاست اس وقت سرمایہ دارانہ آمریت کے بدترین روپ میں نمایاں ہو رہی ہے۔ وہاں آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے، جو فسطائیت کے زیرِ سایہ آج سے چند سال پہلے جرمنی اور اٹلی میں ہو چکا ہے۔ لکھنے والوں کو وہاں آج تحریر و تقریر کی کوئی آزادی باقی نہیں۔ برخلاف اس کے سرمایہ دارانہ آمریت نے آج مختلف پینترے بدل کر ہر ادیب اور فن کار کو اپنا بھاٹ بنانے کی کوشش کی ہے۔ سب سے بڑا ہتھیار اُنہوں نے جو اس سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ وہ وطنیت اور قومیت کا تصور ہے۔ یہ فرسودہ تصورات لکھنے والوں کے ذہنوں پر مسلط کئے گئے ہیں۔ چنانچہ وہاں کے اکثر لکھنے والے اس خول سے باہر نکل کر زندگی کے کسی ترقی پسند معیار کو اپنانے کے قابل ہی نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے وطن پرستی کے روپ میں امریکی سرمائے کے گیت گانے کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی وہاں بعض ایسے ادیب بھی موجود ہیں۔ جو امریکی سرمایہ دارانہ آمریت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ ان کے خیال میں اس کے منصوبے بھی وہی ہیں، جو فسطائیت کے تھے۔ چنانچہ وہ ان نظریات کو انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ انہیں اس میں چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کا مفاد نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے امریکی سرمایہ دارانہ آمریت کی مخالفت کی ہے۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی اس "جرأتِ رندانہ" کو سرمایہ دارانہ آمریت برداشت نہیں کر سکتی۔ اس تحریک کی ترقی اسے منظور نہیں۔ کیونکہ اس کی ترقی اس کی موت ہے۔

چنانچہ امریکی سرمایہ داری نے ان ترقی پسند عناصر کو طرح طرح سے روکنے کی کوشش کی ہے۔ لکھنے والوں کو ایسے شکنجوں میں کس دیا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر سوچ ہی نہیں سکتے۔ فنکاروں کو اس طرح اسیر کر دیا ہے کہ ان کی آواز نکل ہی نہیں سکتی۔ محکمہ احتساب کی تلوار ہر ادیب اور فنکار کے سر پر لٹک رہی ہے۔ اور ایک جنبش میں اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کو UN AMERICAN ACTIVITIES COMMITTEE کہا جاتا ہے۔ اس پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ذرا سے شبہ پر بھی یہ کمیٹی کسی لکھنے والے کو جیل بھیج سکتی ہے، اس کی تخلیقات کو ضبط کر سکتی ہے، اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگا سکتی ہے۔ اس کو جلا وطن کر سکتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ساری کارروائی یک طرفہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں میں سے سنکلیر لیوس، ہووَرڈ فاسٹ، اُپٹن سنکلیر، تھیوڈور ڈریزر، پال رابسن، ہنس آئسلر اور نہ جانے کتنے اسی طرح کے ہیں، جن پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعضوں کو قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں، بعضوں کی تخلیقات کو ضبط کیا گیا ہے۔ بعضوں پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اور بعضے جلا وطن تک کئے گئے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے — آج بھی وہ تحریر و تقریر سے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ ترقی پسند تو تیز آگے بڑھیں۔ اُنہوں نے ہووَرڈ فاسٹ کے الفاظ میں اس بات کا عہد کیا ہے کہ وہ "علم اور اتحاد کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑتے رہیں گے۔ اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک "ان امریکن کمیٹی" اور اسی طرح کے دوسرے فسطائی مظاہرات ماضی کی ایک بھولی ہوئی یاد بن کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ یہ لڑائی جاری

ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گی۔ کیونکہ یہ سوال کسی فرد، کسی قوم، کسی ملک، کسی ادارے اور کسی تحریک کا نہیں، بلکہ انسانیت کا ہے۔

امریکہ میں ایک طرف تو یہ جانباز لکھنے والے رجعت پسندانہ اور غیر انسانی قوتوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے فن کو اور خود اپنے آپ کو ان قوتوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اور اس طرح امریکی سرمایہ دارانہ آمریت ادب اور فن کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہوگئی ہے اور ایسے لکھنے والوں کی ایک فوج تیار کر دی ہے جن کے اقوال و افعال، اور افکار و خیالات کی بنیاد ہی جھوٹ، افترا اور بہتان پر قائم ہیں۔ اور جنہوں نے ادب اور فن کے مقدس پیشے کو ایک طوائف کے پیشے کا مصداق بنا دیا ہے۔ مشہور امریکی ترقی پسند ادیب سنکلر لیوس نے اپنے ایک مقالے MONEY WRites میں ان حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ جارج سیلڈس نے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے نتیجہ یہ ہے کہ والٹر لپ مان ایسے ادیبوں کی آج وہاں قدر ہو رہی ہے۔ جو پہلے ترقی پسند تھا اور جن کے سہارے اس نے خاصی شہرت حاصل کی تھی، لیکن آج وہ امریکن سرمایہ داروں کا بھاٹ ہے۔ اور ایسے رسائل و اخبارات کو لوگ آسمانوں پر چڑھا رہے ہیں جن کی پالیسی غیر ترقی پسندانہ بلکہ آمریت پرستانہ ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کا یہ حال ہے کہ ناشروں نے ڈر کے مارے ان کی کتابیں تک شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اپٹن سنکلر اور ہوورڈ فاسٹ ایسے ادیبوں کو اپنی تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے اس کی ذمہ دار حکومت کی سختیاں اور سرمایہ داروں کی حلقہ بندیاں ہیں۔ جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لایعنی چیزوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ وہاں عام ہے۔

سرمایہ دارانہ آمریت کے یہ اثرات امریکہ ہی تک محدود نہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان بھیانک مناظر پر ایسے پردے ڈال دیئے گئے ہیں کہ ہم میں سے بہت کم کو اس کا علم ہوتا ہے۔ خود ہمارے برعظیم میں ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کے سر سے جو "موج خون" گذر رہی ہے، اس کا علم کتنے افراد کو ہے۔ شاید گنتی کے چند ہوں گے جنہیں اصل صورت حال کا علم ہوگا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومتوں کی گرفت بڑی سخت ہے۔ محکمۂ احتساب جو کچھ کرتا ہے۔ اس کو ظاہر نہیں کر سکتا— ہر بات پردے کے پیچھے ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہمارے یہاں ادیب اور فن کار معمولی کام کرنے والے مزدور کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتا— ہماری صحافت میں برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہونے والے سیاسی لیڈروں کی تقاریر و بیانات کو تو نشر کرنے کی جگہ ہوتی ہے، لیکن ادیب اور فن کار کی ہر بات کو اس کا ہر مسئلہ اس کے نزدیک مہمل، لایعنی اور ناقابل توجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ عوام کو بیوقوف بنا کر ووٹ حاصل کر لینے والے سیاسی لیڈر اور چندے سے پیٹ پالنے والے قومی رہنما کے حالات کا تو اخبارات سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ادیبوں اور فن کاروں کی کوئی خبر نہیں مل سکتی۔ اسلئے کسی کو ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ ہمارے ادیبوں اور فنکاروں میں اس وقت جو کچھ گزر رہی ہے، اس کو سن کر شاید کوئی فرد ایسا ہو جو آنکھوں سے "جوئے خون" بہانے کے لئے مجبور نہ ہو جائے۔

ہمارے اس برعظیم میں آج جو مظالم ادیبوں اور فن کاروں کے ساتھ روا رکھے جا رہے ہیں۔ ان کے سامنے جاگیردارانہ دور کی سختیاں بھی شرماتی ہیں۔ آج نہ صرف انہیں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے، بلکہ بعضوں کو جسمانی تکلیفیں تک پہونچائی جا رہی ہیں۔ تازیانے تک لگائے جا رہے ہیں۔ اسی برعظیم میں ایسے حصے بھی ہیں۔ جہاں ادیبوں اور فن کاروں کی نقل و حرکت پر پابندیاں ہیں۔ پولیس کے پہرے ہیں۔ مکانات کی تلاشیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شاہانہ اور جاگیردارانہ اذیت پرستی کے مظاہر ایک ادیب کی آنکھیں نکال کر بھی کئے گئے ہیں۔ قید خانے میں ایک ادیب کے مسودے کو اس کی آنکھوں کے سامنے جلا کر بھی اپنی تشنگی کو بجھایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بےچارہ ادیب زندگی بھر ملکی کاموں میں پیش پیش رہا ہے۔ اور جس مسودے کو اس کی آنکھوں کے سامنے جلایا گیا ہے، وہ کسی سیاسی موضوع پر نہیں تھا۔ بلکہ ادب کی تاریخ سے متعلق تھا۔ جس کے لئے اس نے راتیں جگائی تھیں۔ برسوں محنت کی تھی۔ شاید متعلقہ حکومت کے ارباب حل و عقد کو بھی ان باتوں کا علم نہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اگر علم نہیں ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اس سلسلے میں مزید تفصیلات لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔

یہ اس صورتِ حال کی صرف ایک جھلک ہے، جس کے زیرِ سایہ اس برِعظیم کے ادیب ان دنوں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں ادب کی تخلیق کا سلسلہ کیسے جاری رہ سکتا ہے۔ جب ادیب کو اتنی بھی آزادی نہ ہو کہ وہ سکون کے ساتھ کسی جگہ بیٹھ کر کام کر سکے۔ اور حالات و واقعات کے متعلق اپنے مافی الضمیر کی خلوص کے ساتھ وضاحت کر سکے، تو پھر ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کی ترقی کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یہیں تک ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ ادیب اور فنکار اس منزل کو آسانی کے ساتھ طے کرنے کی کوشش کرتا، اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے کامیابی بھی ہو جاتی لیکن جب اس کی تخلیقات کا گلا پابندیوں کے شکنجوں میں کس کر گھونٹ دیا جائے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی برسوں کی محنت کو اس کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آتش کر دینے تک سے گریز نہ کیا جائے، تو پھر ادیب اور فن کار صرف یہی کر سکتا ہے کہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے خلاف بغاوت کرے۔ کیونکہ یہ سب کچھ فسطائیت کے بدترین مظاہرے ہیں۔ اور فسطائی مظاہر کو ادب اور فن کا، تہذیب کی خاطر، کلچر کی خاطر، سماج کی خاطر کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو تہذیب، کلچر، اور سماج کا نمائندہ، امانت دار، اور علمبردار سمجھتا ہے۔ اس لئے اس ظلم و تشدد کے خلاف تحریر و تقریر اور فکر و عمل دونوں سے اس کے لئے آواز اُٹھانی ضروری ہے۔ کیا سیاسی بازیگر اور قومی شعبدہ باز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے باز آ جائیگا؟ —— کیا وہ اس کا منہ بند کر دینے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ —— کیا ان کی چالبازیاں چند سکوں کے عوض اس کی صلاحیتوں کو خرید لینے میں کامیاب ہو جائیں گی؟ —— ایں خیال است و محال است و جنوں!

آخر الذکر بات میں نے یونہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ یہ حقیقت ہے۔ ادیبوں اور فن کاروں کی صلاحیتوں کو خرید لینے کے منصوبے آج بڑی شدت اور تیزی سے باندھے جا رہے ہیں —— یہ ظلم و تشدد بھی اسی سلسلے کی پہلی منزل ہے۔ تکنیک یہ ہے کہ پہلے ادیبوں کو طرح طرح سے پریشان کر کے، ان پر مظالم کے پہاڑ توڑ کر اُن کے اوپر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے جینا دوبھر ہو جائے اور پھر ان کی ان پریشانیوں اور زبوں حالیوں سے غلط فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے اندر شامل کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کے مقاصد کا پرچار کریں، اور جمہوریت کے روپ میں جو فسطائیت آج نظر آ رہی ہے اس کی کوئی مخالفت صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہے —— چنانچہ ایک منظم تحریک کا نقشہ اس وقت حکمران طبقے کے ذہنوں میں موجود ہے۔ ترقی پسندوں کی مخالفت میں ایک انجمن بنانے کی کوشش جاری ہے۔ اس کام کے لئے ایک خاصی رقم بھی صرف کرنے کا تہیہ کیا جا چکا ہے —— اس تحریک کا اور انجمن کا سب سے پہلا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ترقی پسندوں اور ان کے بنیادی خیالات و نظریات کی مخالفت کرے —— اور سرمایہ دارانہ آمریت کے گُن گا کر ادبی فسطائیت کے لئے زمین تیار کرے۔ جمہوری قبا میں نظر آنے والے "دیوِ استبداد" کی یہ فسطائی تکنیک نہیں تو اور کیا ہے؟ بہت سے ادیب اس وقت تک خریدے جا چکے ہیں۔ بہت سے خریدے جا رہے ہیں۔ بہت سے خریدے جائیں گے۔ وہی جو نازیوں نے کیا تھا۔ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ وہی کھیل جو امریکی سرمایہ دارانہ آمریت اپنی سرزمین پر کھیل رہی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت یہاں بھی سنائی دے رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کل کے نام نہاد عوام پرست ادیب آج وزیروں کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ حکومتوں کے ہر اقدام کو سراہنا اُنہوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کل تک جو اپنے الحاد اور لامذہبیت کا ڈھول پیٹتے پھرتے تھے۔ اور اس میں فخر محسوس کرتے تھے حالانکہ ترقی پسندوں کو اس وقت بھی ان کی حقیقت معلوم تھی۔ آج بے چاروں کو دھرم اور مذہب نے ایسا متاثر کیا ہے کہ کہیں تو وہ رام راج کے گُن گاتے ہیں۔ اور کہیں اسلامی حکومت کا خواب دیکھتے ہیں۔ کہیں ان کے قلم سے دیوتاؤں کی تعریفیں نکلتی ہیں —— اور کہیں بیچاروں نے سب کچھ چھوڑ کر اب حمد اور نعت لکھنی شروع کر دی ہے۔ ان کی ابن الوقتی اس سے ظاہر ہے۔

ترقی پسند اور حقیقت پرست تو ایسے ادیبوں کے لئے صرف دعائے خیر ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جب ان میں شامل تھے، اس وقت بھی انہیں ان کے خلوص پر شبہ تھا —— بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی صفوں میں گھس کر ایسے ہی ادیبوں نے تحریک کو بدنام کیا۔ اور لوگوں نے اس میں شامل ہونے والے ادیبوں کو ملحد، لامذہب، لذت پرست، اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ حالانکہ ان بے چاروں کو ان باتوں سے کچھ بھی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو صرف انسان دوستی کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج بھی اُن کا نصب العین یہی ہے۔ اور رہتی دنیا تک ہمیشہ ہمیشہ یہی رہے گا۔ دنیا بدل جائے۔ لیکن وہ نہیں بدل

سکتے — کیونکہ ان کے اصول اٹل ہیں، ان کے نظریات عالمگیر ہیں — ان کا نصب العین آفاقی ہے — ادیب بدل جائیں لیکن یہ اصول اور یہ نصب العین نہیں بدل سکتا — چاہے اس کے ماننے والے گنتی کے چند ہی کیوں نہ رہ جائیں۔ اکثریت بہر حال حقانیت کی دلیل نہیں۔

اس لئے صحیح، سچے اور پُر خلوص ترقی پسند ادیبوں کو اس نازک صورت حال کا بغور مطالعہ کرنا ہے۔ کیونکہ اس وقت نہ صرف ان کی اور تحریک کی موت اور زندگی کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ بلکہ اس وقت انسانیت حق اور سچائی کی موت اور زندگی کا سوال بھی درپیش ہے — یہی وقت امتحان کا ہے اس وقت جس نے حالات کو صحیح نہیں سمجھا۔ اس وقت جس کے قدم ڈگمگا گئے اور اس طوفان کی تاب نہ لا سکے۔ اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا آئندہ نسلیں رہتی دنیا تک ان پر لعنت ملامت کرتی رہیں گی۔

تحریک انسانیت کے علمبرداروں کو اس وقت جذباتیت سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ بعضوں کو اس تلخ ماحول نے جذباتی ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ ایسی باتیں کہتے اور کرتے ہیں جس سے ترقی پسند تحریک کو نقصان پہونچتا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ سیاسی، سماجی، معاشی غرض یہ کہ تمام مسائل کو سمجھنے کے لئے ایک تجزیاتی زاویہ نظر سے کام لیا جائے۔ اس طرح ان کی اصل روح سے واقفیت حاصل ہوگی۔ اور ان کے سارے نشیب و فراز کا اندازہ ہو سکے گا۔ یہ سب کچھ ادیب کے لئے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اب وہ صرف رومان کی سہانی دنیاؤں میں بسیرا لینے والا ادیب ہی نہیں رہ گیا ہے، بلکہ سماج کا ایک ایسا فرد ہے جو اس کی ساری کشمکش میں برابر کا حصّہ لینے کے لئے مجبور ہے۔ اب وہ ماحول سے فرار اختیار کر کے صرف حسن و عشق کی لایعنی داستانیں ہی نہیں سنا سکتا۔ بلکہ اسے زندگی، سماج اور انسانیت کے لئے کچھ کرنا بھی ہے — اور بہت کچھ کرنا ہے۔ اسے فسطائی آمریت کی قوتوں کے خلاف لڑنا ہے۔ عوام میں ایک نئی زندگی پیدا کرنی ہے — ایک نئے نظام کی بنیادیں ڈالنی ہیں۔ اس کے لئے قلم کی بھی ضرورت ہے اور تلوار کی بھی! موقع آئے تو پیچھے ادیب اور فن کار کو قلم کے ساتھ ساتھ تلوار اور رائفل سے بھی کام لینا ہوگا — لیکن تلوار اور رائفل کا کام بہر حال وقتی ہوگا۔ وہ قلم کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت ہے — ان حالات سے دوچار ہونے کیلئے ہر ادیب اور فنکار کو تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اب سرمایہ دارانہ آمریت کے فسطائی منصوبوں نے ایک ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے، جس سے مقابلہ کرنے کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارۂ کار نہیں — وہ دن دور نہیں جب بدلتے ہوئے حالات ہر سچے ادیب کو اس اقدام کے لئے مجبور کرینگے۔ اور اس کو میدان میں آنا پڑے گا۔ کیونکہ کلچر، سماج اور انسانیت اسے عزیز ہیں۔ وہ ان کا خون ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا — ان کی تباہی اس کے خیال میں موجودہ نسل کی تباہی ہے۔ اس تہذیبی سرمائے کی تباہی ہے، جو موجودہ نسل کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت ہے۔

بے شک یہ زندگی کی بڑی ہی کٹھن اور دشوار گذار منزل ہے، لیکن اگر انسانیت پرستی کے نصب العین سے وابستگی میں پختگی ہے تو پھر یہ ساری منزلیں آسانی کے ساتھ طے ہو جائیں گی۔ پہاڑ موم ہو جائیں گے۔ آہنی زنجیریں خود بخود ٹوٹ کے گرنے لگیں گی۔ طوق و سلاسل کا وجود باقی نہ رہے گا۔ اور جیل خانے زمین پر آ رہیں گے — اور پھر ان سب کے کھنڈروں پر زندگی ایک ایسا نغمہ چھیڑے گی۔ جس کی روشنی کی زرتار مسکراہٹوں میں ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کو بغیر کسی تلاش اور بغیر کسی کاوش کے وہ سب کچھ مل سکے گا۔ جس کے وہ ازل سے متمنی ہیں — لیکن جس کو نامساعد حالات نے بیچ میں حائل ہو کر جسکو آج تک ان کی محفل میں جلوہ گر ہونے سے باز رکھا ہے۔

جب کبھی حقوق ملکیت اور انسانی حقوق کے درمیان جنگ ہوگی تو
فتح۔ انسانی حقوق ہی کو ہوگی

⁂

سید حسن طاہر

ایک ادیب — ایک انسان

ایک بہترین شکاری، ایک مشاق مکہ باز، ایک تجربہ کار سپاہی، ایک بہترین مصنف اگرچہ آج کل کے زمانے میں معجزے یا "خرق عادت" کا تصور محض دل بہلاوہ ہے۔ پھر بھی انسانی فکر و عمل کے معجزے ہوتے ہی رہینگے "گھنٹی کس کیلئے بجتی ہے" (FOR WHOM THE BELL TOLLS) اور "جنگ کو خیرباد" (FAREWELL TO ARMS) کا مصنف "ارنسٹ ہمینگ وے" ایک ایسا ہی عجوبہ ہے۔

یہ ادیب جو پچاس سال کی عمر میں ایک بہترین صحت کا مالک ہے۔ اور دیکھنے میں پیشہ ور سپنیڈ و نظر آتا ہے۔ اب تک چار شادیاں کر چکا ہے۔ دنیا کی دونوں بڑی جنگوں میں نہ صرف اطلاعات رسانی کرتا رہا ہے۔ بلکہ بطور سپاہی ہتھیار بند ہو کر لڑا ہے زخمی ہوا ہے۔ قید ہوتے ہوتے بچا ہے۔ اور فوج کے محکمہ جاسوسی کیلئے مشکل سے مشکل فرائض کم از کم وقت اور خرچ پر سرانجام دیتا رہا ہے۔

اس کا باپ ڈاکٹر تھا اور پہلے درجے کا شوقین شکاری تھا۔ اُس کی ماں اپنے گرجا کی بہترین مغنیہ تھی۔ یہ دونوں خوبیاں اس نے ورثے میں پائے ہیں۔ ایک طرف سے شکار دوسری طرف سے موسیقی۔ اس نے زندگی کے تضاد کو ایک اور ڈھنگ سے بھی نمایاں کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں شامل ہونے سے پہلے اُس نے ایک پادری کی طرح چھاج ایسی ڈاڑھی بڑھالی اور "باکسنگ رنگ" میں اپنے چوڑے شانوں، بالوں بھری چھاتی اور داڑھی کے اوپر ایک صحت مند مسکراہٹ سمیت ایک زبردست اور آزمودہ کار مکے باز کی حیثیت سے مشہور ہو گیا جسمانی ریاضت وہ اسلئے کرتا تھا۔ کہ جنگ کی ضروریات کے مطابق جسم میں پھرتی اور قوت مدافعت بڑھ جائے۔

وہ صبح جلدی اٹھتا ہے۔ دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک اچھا کامیاب مصنف جسمانی طور پر اتنا مکمل صحت مند انسان ہے۔ یہ چیز دنیا کے اور ملکوں میں شاید باعث حیرت نہ ہو مگر ہمارے ایشیائی ملکوں اور خصوصاً اس برِ صغیر ہند و پاک کے لئے ضرور "پریوں کی کہانی" کا سا اثر رکھتی ہے یہاں تو فنکار کے لئے ایک دبلا پتلا نحیف و نزار جسم (جسے غزل میں جان ناتواں کہ کر فخر کیا جاتا ہے) اور عجیب بے ہنگم سراپا، ایک لازمہ کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اور یہاں فنکار کے ہاں پرفن کی جستجو سے زیادہ صدیوں کی بھوک، اچھی زندگی سے محرومی، حالات کی نامساعدت، زندگی کے تلخ تجربے اور زندگی کی لطافتوں کے یکسر فقدان کا احساس، اور اس میں اضافے کے طور پر جنسی آسودگی۔ یہ سبھی کچھ مصوّر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس تقابل میں کتنا تفاوت ہے، ایک طرف بھرپور صحت مند زندگی، دوسری طرف اس کا مکمل فقدان، ایک طرف زندگی مجسم ہو کر رہ گئی ہے اور دوسری طرف اس کا فقدان بھی مجسم ہو کر رہ گیا ہے۔

"ہیمنگ وے" نے ابتک چار شادیاں کی ہیں۔ تین سیدھی سادی طلاق پر منتج ہوئی ہیں۔ کوئی خاص ناخوشگوار واقعہ اس سلسلے میں بیان نہیں کیا گیا۔ پہلی شادی اس نے بائیس سال کی عمر میں کی۔ اُس کی پہلی بیوی "ہیڈلے رچرڈسن" بھی ایک الھڑ دوشیزہ تھی۔

دوسری شادی اس نے ایک اخبار نویس خاتون سے کی۔ شکل و صورت اور جسمانی وجاہت کے سلسلے میں یہ خاتون کچھ زیادہ قابل ذکر "نہیں تھی"۔ تیسری شادی اُس نے چین کی خانہ جنگی کے دوران میں کی۔ اس کی یہ بیوی بھی ایک صاحب قلم خاتون تھی۔ جسے ہمینگ وے سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ یہ خاتون بہت خوبصورت تھی اس کی موجودہ بیوی "میری ویلش" ہے۔ وہ بھی عمر کی سنجیدہ منزل میں پہنچ چکی ہے

وہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں سکول سے کچھ زیادہ مانوس نہیں تھا۔ دو دفعہ اس نے سکول سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سکول کے پرچے

کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اور سکول کے سہ ماہی رسالے کے لئے کہانیاں بھی لکھتا رہتا تھا۔ سکول کی فٹ بال ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اور تیراکی میں ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اس کے
باوجود وہ سکول سے ناخوش تھا۔ عام طور پر اکیلا رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ مقابلہ کرنے کی اس میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ ایسا کھلاڑی نہیں تھا۔ جس نے لکھنے کا فن
اختیار کیا ہو۔ بلکہ ایسا ادیب تھا جس نے بڑی مشقت سے کھیلنا سیکھا ہو

سکول کی تعلیم کے اختتام پر ہیمنگ وے کالج میں داخل ہوا۔ مگر ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی اُس نے کالج سے علیحدہ ہونے کی ٹھان لی۔ پچھلی جنگ عظیم کے
اختتام سے کچھ پہلے امریکہ بھی حلیفوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا تھا۔ ہیمنگ وے نے سوچا چلو فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ مگر ان دنوں اس کی ایک آنکھ کھیل میں
چوٹ لگ جانے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی اسلئے ڈاکٹر نے اُسے فوج میں لینے سے انکار کر دیا۔

ہیمنگ وے کالج واپس نہیں گیا۔ اور اپنی عمر کے متعلق جھوٹ بول کر ایک اخبار کے ادارے میں شامل ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہ ریڈ کراس کے ذریعے مختلف
ملکوں کی فوجوں کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اور اسی سلسلے میں اٹلی بھی گیا۔ کیونکہ ان دنوں ریڈ کراس والے زیادہ سخت طبی معائنہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں ایک بم سے زخمی ہو
کر وہ ہسپتال چلا گیا۔ جہاں اُس کی ٹانگ میں سے ڈاکٹروں نے لوہے کے ۲۳۷ ٹکڑے نکالے۔ وہاں سے اطالوی فوج کے دو بہت بڑے اعزازات سے
نوازا گیا اور پچاس ڈالر سالانہ کی پنشن بھی ملی۔ وہ گھر لوٹا اور جنگ کی یہ نشانیاں بھی ساتھ لیتا گیا۔ جن میں ایک ایلومینیم کی ٹوپی اور مصنوعی ہڈی اور کچھ لوہے کے ٹکڑے
جو اپریشن سے نکالے نہ جا سکے تھے شامل تھے، ان میں سے ایک اب بھی تیس سال کے بعد اسکے گھٹنے میں سے باہر نکل رہا ہے۔ وہ ایک عرصے تک راتوں کو سو نہیں سکتا تھا
دن کو البتہ اُسے نیند سی آتی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی۔ کہ بم کا حادثہ رات کے وقت پیش آیا تھا۔ اب پھر اُس نے نوکری ڈھونڈنا شروع کی۔ اس زمانے میں اس کی
کہانیاں مقبول ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ شیروڈ اینڈرسن سے ملا۔ اور بھی بہت سے فنکاروں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اینڈرسن اُسے لکھنے کے متعلق مفید مشورے دیتا رہا
اسکے بعد وہ ایک بار پھر ترکی۔ یونانی جنگ میں بطور نامہ نگار کے کام کرنے چلا گیا۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا تھا۔ اس کے پاس ایک سوٹ کیس میں محفوظ تھا۔ اور یہ
سوٹ کیس اثنائے سفر میں گم ہو گیا۔ مگر اس حادثے نے ہیمنگ وے کو زیادہ متاثر نہ کیا۔ بلکہ اُس نے اور بھی توجہ اور محنت سے لکھنا شروع کر دیا۔ اُس نے فن تحریر کو ایک
اہم فن سمجھ کر اُس کا مطالعہ کیا اور اس میں اتنی محنت کی جیسے ایک اقلیدس کا طالب علم اپنے علم میں کرتا ہے گرٹروڈ اور ایذرا پاؤنڈ اس زمانے میں اُسکے استاد تھے۔ بعد میں
ہیمنگ وے نے ایک دفعہ کہا تھا کہ " ایذرا پاؤنڈ اکثر رائے دیتا تھا۔ مگر جب کبھی مجھے اس کی رائے غلط معلوم ہوتی وہ اس حد تک غلط ہوتی تھی۔ کہ کوئی بھی دوسرا شخص اسکے
غلط ہونے میں ذرہ برابر شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔
"گرٹروڈ سٹین کے متعلق اُس نے کہا وہ ہمیشہ درست رائے دیتی تھیں۔

اس کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں فرانس میں چھپیں۔ پھر افسانوں کا ایک مجموعہ "ہمارے زمانے میں" IN OUR TIME امریکہ میں چھپا۔ مگر اس
میں اُسے مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ صرف ۱۳۳۵ کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ مگر ان میں سے چند سو بک سکیں۔ اگلے سال اس کی کتاب THE TORRENTS OF SPRIN
بھی بس معمولی تعداد میں بکی۔ پھر THE SUN ALSO RISES چھپی۔ اسے فوری کامیابی تو ہوئی۔ مگر زیادہ نہیں۔ ڈیڑھ سال
کے عرصے میں صرف چھبیس ہزار جلدیں فروخت ہوئیں (یہ غور طلب ہے ہمارے یہاں تو کوئی روزنامہ اخبار بھی شاید اس تعداد کو پہنچتا ہو) اب رفتہ رفتہ لوگوں
نے محسوس کیا کہ ایک بہت مقبول ادیب سامنے آ رہا ہے۔ ہیمنگ وے نئی نسلوں کیلئے ایک نیا پیغام دے رہا تھا۔ جیسا کہ ایک صدی پیشتر بائرن نے دیا تھا اور
اب لوگوں میں اس کی مقبولیت اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ وہ اسکے کرداروں کو بہت پسند کرنے لگے۔ اور ان کی طرح حرکات و سکنات بھی کرنے لگے۔ اس کی کتابوں کے
مکالمے لوگوں کو نوک زباں ہونے لگے۔ اس زمانے میں وہ پیرس میں رہتا تھا۔ اور دن کا کھانا وہ کسی خوانچہ فروش سے چند پیسوں کے عوض خرید لیا کرتا تھا۔ اس نے
اپنی اہمیت محسوس کر لی تھی۔ اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی اپنی مرضی کے خلاف دبنے کو تیار نہ تھا۔ وہ امریکہ واپس گیا۔ اور اب اُس نے A FARE
WELL TO ARMS لکھنا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں اس نے کتاب مکمل کر لی پھر وہ مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اور امید سے زیادہ کامیاب رہا
اسکے بعد سپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اُسے سپین سے بہت محبت تھی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اُسے سپین کے لئے ضرور کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ کئی

بارسپین گیا۔ وہاں اس نے جمہوری فوجوں کے لئے چالیس ہزار ڈالر جمع کئے۔ جن سے ایمبولینس گاڑیاں خریدی گئیں۔ آخری بار سپین سے واپس آکر جب کہ وہ اپنی دوسری بیوی سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس نے FOR WHOM THE BELL TOLLS جیسی عظیم کتاب کی تخلیق میں مصروف ہو گیا "آندرے مارلو" اور ہیمنگ وے نے آپس میں طے کیا کہ وہ دونو سپین کی جنگ کے متعلق لکھینگے۔ مارلو، نے بہت جلدی کی اور اپنی کتاب "L'ESPAO" یا انسان کی امید" اسی سال شائع کر دی۔ مگر جب تک ہیمنگ وے اپنی کتاب ختم کرے۔ میڈرڈ فتح ہو چکا تھا۔

اس کتاب کے متعلق اُس کا اپنا خیال ہے کہ یہ اُس کی عزیز ترین تصنیف ہے۔ اب تک اس کی دس لاکھ جلدیں امریکہ میں فروخت ہو چکی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی بہت بڑی تعداد میں یہ کتاب بکی۔ اور دوسری جنگِ عظیم میں امریکن اور روسی فوجوں نے اسے فنِ جنگ پر ایک مبسوط اور مدلل کتاب سمجھ کر چھاپہ مار دستوں کی جنگ کے لئے ہدایات ہائے کے طور پر استعمال کیا۔

ہیمنگ وے کے لکھنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ اس کی بڑی بڑی کتابیں کافی وقفے کے بعد لکھی گئی ہیں AFARFWELL TO ARMS لکھنے میں اس نے پورا ایک سال صرف کیا اور FOR WHOM THE BELL TOLLS لکھنے میں اُسے سترہ مہینے لگے۔ وہ آجکل ایک اور ناول لکھ رہا ہے۔ اور اس عرصے کو نکال کر جب تک کہ وہ گذشتہ جنگِ عظیم میں بری، بحری اور ہوائی فوج میں رہا، اسے اس کتاب پر پانچ یا چھ سال کام کرتے ہوئے ہو جائینگے۔

وہ جب اپنا ناول لکھنا شروع کرتا ہے تو بالکل ایسے ہی شروع کرتا ہے۔ جیسے کوئی سیاح کسی نامعلوم خطے میں سفر کر رہا ہو۔ اُس کو انجام کے متعلق کچھ ہلکا سا تصور ہوتا ہے۔ مگر یہ انجام بدل بھی سکتا ہے۔ اُسے اپنے سفر میں ایک سیدھا راستہ تو نظر آتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے کتنا سفر کرنا پڑے گا، یا راستے میں اُسے کیا کیا نظر آئے گا۔

وہ صبح سویرے اٹھ کر چھ بجے اپنی میز پر ڈٹ جاتا ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے وہ پہلے لکھے ہوئے حصے کو بغور دیکھتا ہے۔ کہ خیالات میں تسلسل پیدا ہو جائے۔ یہ عمل وہ جاری رکھتا ہے۔ جب تک کہ ناول کے وسط میں نہ پہنچ جائے۔ اسکے بعد وہ کم از کم پچھلے چند ابواب ضرور پڑھتا ہے۔ وہ پنسل سے لکھتا ہے۔ اس کی دوسری بیوی پالین، کہا کرتی تھی۔ کہ وہ اپنی انگلیوں سے سوچتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک وہ قریباً قریباً اپنے دن کے کام سے فارغ ہو جاتا ہے اکثر وہ ڈیڑھ دو گھنٹے اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ اس کا مقولہ ہے کہ لکھتے لکھتے اس وقت رُکنا چاہیئے۔ جب ابھی خیالات میں تسلسل جاری ہو اور زیادہ لکھنے کو جی چاہے ایسا کرنے سے کبھی بھی ذہن منجمد نہیں ہوگا" فاکنر FAULKNER کو وہ بہترین لکھنے والا سمجھتا ہے۔ مگر اُسے اُس سے یہی شکایت ہے۔ کہ "وہ جب تھک کر چور ہو جاتا ہے پھر بھی لکھنا جاری رکھتا ہے۔ اور پھر وہ کانٹ چھانٹ بالکل نہیں کرتا"

ہیمنگ وے اپنی روزانہ ڈائری لکھتا ہے۔ اور اپنے کام کا احتساب کرتا رہتا ہے۔ ایک ہفتے میں اس نے پیر کے روز ۴۸۵ الفاظ لکھے، منگل کے روز ۵۱۶، بدھ کے دن ۶۳۸، جمعرات کے روز ۱٬912 اور جمعہ کے روز ۲۷۶، یعنی مجموعی طور پر ہفتے بھر میں اُس نے ۲۸۲۷ الفاظ لکھے۔ ہفتے کے روز وہ مچھلیاں پکڑنے چلا گیا اور اتوار کو اس نے مینٹانزاس MAM TANZAS کی سیر کی۔ ناول کے اہم مقامات پر پہنچکر اُس کی رفتار بہت مدھم ہو جاتی ہے مثلاً ۲۷۶ الفاظ یومیہ۔ مکالمے لکھتے ہوئے وہ بہت تیزی سے کام کر سکتا ہے۔ اور اُس کا کہنا ہے۔ کہ اگر وہ چار کرداروں کو مکالمے میں مشغول کر سکے۔ تو سارا کام ایک خواب کی سی تیزی اور آسانی سے ہو جاتا ہے"

جب وہ پہلی بار ایک ناول ختم کر لیتا ہے تو پھر کانٹ چھانٹ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بے رحمی سے اپنے لکھے ہوئے صفحوں پر لکیریں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کہیں اُسے تصنع یا احساس کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی شدت نظر آتی ہے۔ وہ اُس حصے کو خارج کر دیتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ اگر کوئی مصنف ایک دفعہ مصنوعی طور پر زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور سستی جذباتیت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تو وہ اپنے سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک سیب خراب ہو کر سارے ٹوکرے کو خراب کر دے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہمیشہ اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ رفتہ رفتہ اپنی کتابوں پر پہلے کی نسبت زیادہ زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے "لکھنا بھی ایک ہنر ہے۔ اور میں ابھی اسے اچھی طرح مکمل طور پر سیکھنے کی سر توڑ کوشش

بقیہ بر صفحہ ۳۹

مسعود اشعر

چین میں عوامی جدوجہد

ہم نے سنگیت کی مدھر دھنوں میں دھانوں کی تلاش کی
ہماری امیدوں کے ساتھ ساتھ دھان کے پودے بھی پھلے پھولے ۔

کڑی محنت کے بعد بیل گھاس چر رہے ہیں ۔
آقا لوگ مزے سے چاول کھا رہے ہیں ۔
اور ہم کسان لوگ دھان کے چھلکوں کے لئے ترس رہے ہیں ۔

اور —
سرکاری دفتر کا پھاٹک جنوب کی سمت کھلتا ہے ۔
جہاں ہمیں نقد لگان دینا پڑتا ہے
جس کی نہ تو کوئی وجہ ہے ۔
اور نہ ہی کوئی تک ہے!!"

یہ ہے چینی قوم کا احساس جو سینکڑوں سال پہلے کے لوک گیتوں میں بھی نمایاں ہے! یہی احساس تھا جس نے ملکی شاہنشاہوں اور غیر ملکی سامراجیوں کے خلاف چینی عوام کے دل میں نفرت کی آگ بھر دی ۔ یہاں تک کہ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور آج سارا چین، ان کا اپنا پیارا چین — ان کے ہاتھوں میں ہے ۔

چینی زبان کے پروفیسر تان ین شان نے اپنے ایک مضمون میں ایک لوک گیت نقل کیا تھا ۔ جس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ چینی قوم بہت صابر و شاکر، اور ہر چیز پر قناعت کرنے والی ہوتی ہے ۔ وہ گیت تھا ۔

"جب سورج نکلتا ہے تو میں بیدار ہو جاتا ہوں ۔
اور جب سورج ڈوبتا ہے میں آرام کرتا ہوں ۔
پانی پینے کے لئے کنواں کھود لیتا ہوں
اور کھانے کے لئے زمین جوتتا ہوں ۔

شہنشاہ کی حکومت اس کے پاس رہے۔

مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے؟

لیکن پروفیسر صاحب جس ذہنیت کے مالک ہیں۔ اسی ذہنیت کے لوگوں کی ترجمانی یہ گیت کرتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے خیالی ہیں۔ جن کے دماغ میں رجعت پسندانہ خیالات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے جنہیں اتنا دبایا گیا تھا کہ وہ بلندی کا احساس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کے خیالات چیانگ کے غلام ہی کر سکتے ہیں۔ جنہیں زبردستی قناعت سکھائی جاتی ہے۔

چینی عوام میں جب سے احساس اور بیداری پیدا ہوئی ہے تو وہ یہ نہیں کہتے کہ شاہنشاہ کی حکومت اس کے پاس رہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے بلکہ وہ شاہنشاہ اور حکومت دونوں کا خاتمہ کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے ہیں وہ اپنی بھلائی اسی میں دیکھنے لگے کہ اس حکومت کا ہی خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ جس میں لینے دینے کا سوال پیدا ہو۔!

پرل بک کا ناول GOOD EARTH شاہد ہے کہ چینی عوام عرصے سے انقلابی تحریکیں ابھارتے چلے آتے ہیں۔ جب کبھی ان میں سے کوئی شخص بہت زیادہ امیر ہوا۔ اس نے کوٹھیاں اور بنگلے بنوائے۔ نوکر غلام رکھنا شروع کئے۔ تب ہی بھوکے ننگے عوام نے اس پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ اس کا سارا سامان۔ سارا مال۔ آپس میں تقسیم کر لیا — یہ تحریکیں مختلف طریقوں سے مختلف زمانوں میں ہوتی چلی آئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کے حکمران اپنی فوجی طاقت کے بل پر حکومت کرتے تھے۔

چین نے ایک وہ بھی زمانہ دیکھا تھا جب "چی" کے راج (۱۱۲۲ ق م تا ۲۵۵ ق۔م) میں "چنگ تساین" کا رواج تھا۔ ساری زمین حکومت کی سمجھی جاتی تھی اور سب میں برابر تقسیم کر دی گئی تھی۔ ہر مربع "لی" کے نو حصے کئے گئے تھے ہر حصہ میں سو "موؤس" زمین تھی۔ اس نو سو موؤس زمین میں سے ۸۰۰ موؤس عوام میں ان کے گزارے کے لئے تقسیم کر دی گئی تھی اور باقی ایک سو موؤس سرکاری یا پنچایتی زمین کے طور پر چھوڑ دی گئی تھی۔ جس سے سرکاری کام چلتا تھا آس پاس کے کسانوں کا فرض ہوتا تھا کہ وہ باری باری پنچایتی زمین کو جوتیں سکے ملک کی زمین اسی طرح دو حصوں میں منقسم تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے "شیہ ہوانگ تی" کا دور بھی دیکھا تھا۔ جب دیوار اعظم بنوانے کے لئے کروڑوں جانیں ضائع کی گئی تھیں۔ جب تمام علم و ادب کی کتابیں جلا ڈالی گئی تھیں اور سارے ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو قتل کرا دیا گیا تھا۔

لیکن "افیون کی جنگ" ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۲ء کے بعد جو مسلسل ظلم و ستم چینی لوگوں پر ہونا شروع ہوئے وہ ان تمام باتوں سے مختلف تھے۔ یہ یورپین اقوام کے ذلیل ترین اخلاق کا نمونہ تھے۔ چاروں طرف سے چین پر یلغار کر دی گئی تھی۔ غیر ملکی بھیڑیے چین کے حصے بخرے کرنے لگے تھے۔ ایک طرف برطانیہ اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف فرانس امریکہ جرمنی اور روس اپنی تجارت کے لئے چین پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے۔ یہیں تک کہ ان ملکوں نے آپس میں متحد ہو کر اسے ہڑپ کر لینے کی کوشش کی۔ انہوں نے زبردستی اپنے لئے بین الاقوامی تجارتی بندرگاہیں کھلوائیں۔ اور گلا گھونٹ کر جونک بن کر اپنے لئے مراعات اور پٹے کے علاقے حاصل کئے۔

برطانیہ فرانس جرمنی اور روس نے "اقتدار کے حلقے" کے نام سے چین کے اکثر علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جرمنی کے خلیج "کیاؤ چو" کی بندرگاہ "چنگ تاؤ" پر قبضہ کر لیا اور اردگرد کے ۲۰۰ مربع میل زمین بھی ہتھیا لی اسکے ساتھ ہی جرمن کارخانہ داروں کے لئے کارخانے کھولنے اور کانیں کھودنے کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ فرانس نے ۹۹ سال کے پٹہ پر صوبہ "کوانٹنگ" میں "کوانگچو وان" کا ۰۰ میل کا علاقہ حاصل کر لیا۔ روس نے ۲۵ سال کے لئے پورٹ آرتھر کا پٹہ کرا لیا اور اس کے آس پاس ۱۳ سو مربع میل علاقہ اور ریل کی سہولتیں حاصل کر لیں۔ برطانیہ نے چین کو مجبور کیا کہ اسے ہوائی بندرگاہ دیدے۔ ان کے ساتھ ہی جاپان بھی پہلے میں میٹھا چھرا گھونپ رہا تھا وہ بھی وقتاً فوقتاً حملے کرتا رہتا تھا۔

امریکہ سب سے بازی لے گیا اس نے شکریں ملا کر زہر دیا تھا۔ اس نے اپنے لئے آزادانہ داخلہ کی گارنٹی لی اور رفتہ رفتہ تمام چین پر اپنا اقتدار قائم کر لیا

چاروں طرف اس نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے۔ گراموفون اور ریڈیو سیٹ کی تجارت سے لے کر دیا سلائی کے بکس اور پہننے کے کپڑوں تک کی تجارت پر اس نے قبضہ کر لیا۔ سارا چین اس کے قبضۂ قدرت میں آ گیا۔ اس نے چین کو اپنے ڈالر کا غلام بنا لیا۔ چیانگ جیسا شخص تو اس کا فرمانبردار خادم تھا ہی۔

لیکن عوام بھی اس زمانہ میں خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ انہیں تمام چیزوں کا احساس تھا۔ وہ ان غیر ملکی ڈاکوؤں کو اچھی طرح سمجھتے تھے حالات نے تو ان کے سینہ میں آگ بھر دی تھی یہ آگ پہلی مرتبہ بغاوت کی شکل میں نمودار ہوئی۔

یہ بغاوت "ہنگ سوچوآن" کی قیادت میں ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی۔ جو شروع تو مذہبی رنگ سے ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں قومیت کا روپ اختیار کر گئی۔ اکثر عوام اس تحریک میں شامل تھے۔ وہ غیر ملکی تاجروں اور ملکی حکمرانوں کے خلاف اٹھے تھے۔ گویا انہوں نے انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی ——

حالانکہ یہ بغاوت چینی حکومت نے انگریزوں کی مدد سے کچل دی۔ لیکن جو چنگاری عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ وہ برابر شعلہ بنتی گئی۔

اور یہ لاوا سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد پھر پھوٹ پڑا۔ اس مرتبہ غیر ملکی مشنری اور عیسائیوں کو خوب مارا پیٹا گیا۔ انہیں قتل کیا گیا۔ یورپین اور فرانسیسی دفتر کارخانے اور سفارت خانے گھیر لئے گئے۔ انہیں نقصان پہنچایا گیا۔ لیکن ابھی ظلم کا بدلہ پوری طرح لینے بھی نہ پائے تھے کہ فرانس، برطانیہ امریکہ جرمنی اور جاپان ان پانچوں نے مل کر اپنی فوجوں اور توپ گولوں سے اس بغاوت کا گلا گھونٹ دیا۔ عوام پر جی کھول کر ظلم کئے گئے۔ گھروں کو بیدردی سے جلایا گیا۔ لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ عورتوں بوڑھوں کو اور بچوں تک کو قتل کر دیا گیا۔ اسکے باوجود تحریک ختم نہ ہو سکی۔ عوام کے دل کی لگن ختم نہ ہو سکی۔ اور سنہ ۱۹۱۱ء کا انقلاب آ کر ہی رہا۔ چینی قوم نے ایک مرتبہ پھر اپنی قسمت کو پلٹنے کی کوشش کر ہی لی۔

لیکن ڈاکٹر سن یات سین جس پالیسی کے ماتحت انقلاب لانا چاہتے تھے۔ وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان کے بنائے ہوئے اصول ان کے سامنے ہی نظر انداز کر دیئے گئے — ان کا لایا ہوا انقلاب ان کے سامنے ہی ناکام ہو گیا —— ان کی زندگی ہی میں "یوآن" نے دھوکہ دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہی وہ ناکامی تھی۔ جس کے متعلق انہوں نے لکھا تھا: "انقلاب کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔

(۱) جدوجہد اور جنگ۔

(۲) انقلابی لیڈروں کے ہاتھوں میں تھوڑے دنوں حکومت کی باگ ڈور — اور پھر

(۳) عوام کے ہاتھوں میں طاقت۔

بدقسمتی سے چین میں یہ تمام چیزیں نہیں ہو سکیں۔ جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں"۔

اور جب سن یات سین کے بعد چیانگ کائی شیک ان کا جانشین ہوا۔ یعنی ڈاکٹر سن کی جمہوریت کا مالک ہوا۔ تو اس نے بے غیرتی اور بے حیائی کی انتہا کر دی۔ اس نے غیر ملکی غلامی کو اپنے سر خود منڈھا۔ اس نے امریکن ڈالروں کے آگے نیازمندانہ طور پر سر جھکا دیا۔ اور ان کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھانے لگا اس نے جان بوجھ کر لٹیروں کو اپنا گھر لوٹ لینے کی دعوت دی۔ یہی نہیں اس نے تو تمام ملک کی باگ ڈور ان مہاجنوں کے ہاتھ میں دیدی۔ اور ان جونکوں کو چین کا خون چوسنے کی کھلی اجازت دیدی۔ انہوں نے بھی جہاں تک اس سے لوٹا جا سکتا تھا لوٹا۔ انہیں کیوں ہمدردی ہونے لگی تھی۔ ان کے لئے تو چیانگ کیا آیا تھا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔

چیانگ کی پالیسی کی وضاحت تو جب ہی ہو گئی تھی۔ جب اس نے کومنتانگ سے کمیونسٹوں کو علیحدہ کر دیا تھا اور روس سے دوستی کا معاہدہ توڑ ڈالا تھا جاننے والے اسی وقت جان گئے تھے کہ چیانگ کس راستہ پر چل رہا ہے۔ اور وہ کیا چاہتا ہے۔ عوام نے بھی اس کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ چیانگ وطن دوست نہیں بلکہ بجائے وطن دشمن اور ظالم شخص ہے۔

اور پھر — اس کے عہد میں جو مصائب اور مشکلات کے پہاڑ چین پر ٹوٹ پڑے۔ ان سے بھی لوگ خوب واقف تھے۔ غیر ملکی درآمد نے جو چینی صنعت وتجارت پر کاری ضرب لگائی تھی، وہ بھی لوگ نہیں بھول سکتے تھے، عام کساد بازاری، بھوک، قحط، جاپانی حملے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی چیرہ دستیاں،

یہ تمام چیزیں عوام کے سامنے تھیں۔ وہ اسے محسوس کر رہے تھے۔

اور ان سب سے زیادہ کومن تانگ کے ظالم فوجی تھے۔ جن کی زیادتیاں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

ڈاکٹر سن یات سین نے کومن تانگ کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی تھی۔

(۱) من تسو چوئی — یعنی قومی خود مختاری۔

(۲) من چوآن چوئی۔ یعنی جمہوریت۔

(۳) من شین چوئی۔ یعنی عوام کی معاشی تنظیم

لیکن یہ جماعت چیانگ کے ہاتھوں میں اپنی تمام باتوں کو بھول گئی۔ اس نے سن یات سین کی تعلیم کو بالکل فراموش کر دیا۔ اب وہ با اقتدار جماعت تھی۔ انکے فوجی جو چاہتے کر سکتے تھے اور جو چاہتے دوسروں سے کرا سکتے تھے۔ غریبوں کی لوٹ کھسوٹ تو ان کا عام مشغلہ تھا۔ ویسے بھی وہ ہر چیز پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ کس چیز کی ضرورت انہیں تکلیف نہیں دیتی تھی۔ وہ جب چاہتے اور جس سے چاہتے وہ چیز چھین سکتے تھے۔ عام طور پر ترقی پسند ادیبوں، طالب علموں اور فنکاروں کے یہ لوگ سخت دشمن تھے۔ ان بے گناہوں کو گولی سے اڑانا ذلیل کرنا ان کے روزانہ پروگرام میں شامل تھا — لیکن جتنی زیادتیاں بڑھتی گئیں، اتنی عوام میں بیداری ابھرتی گئی۔ جس قدر ادھر سے عوام پر ظلم ہوتے تھے۔ عوام کے اندر اسی قدر بغاوت پھوٹتی تھی۔

"تان یُن شان" نے جہاں چینیوں کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ چینی لوگوں میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب مسلسل کسی کو ستایا جائے تو آخر کسی وقت اسے بھی غصہ آ ہی جائیگا۔ اور جھنجھلا کر اس کا تدارک اس طرح کریگا۔ جس سے یا تو اس ظلم کا ہی خاتمہ ہو جائیگا یا پھر وہ ظلم اسے بالکل ختم کر دے — اور چینی قوم تو پہلے ہی سے انقلابی تحریکوں میں حصہ لیتی چلی آئی ہے۔ اُسکے لئے ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔

ان تمام باتوں نے مل جل کر ایک نئی تحریک کو جنم دیا جس کا مقصد ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کر دینا تھا۔ چین سے تمام رجعت پسندوں کا صفایا کرنا اور ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔

اس تحریک کی بنیاد تو اسی وقت پڑ چکی تھی۔ جب چیانگ نے کومن تانگ کو کمیونسٹوں سے پاک کیا تھا۔ لیکن جب کمیونسٹوں نے وسطی چین میں عوام کی مدد سے ۱۹۳۱ء میں ایک عوامی ریاست قائم کی تو اس وقت جو بربریت چیانگ اور اس کے غلام کومن تانگ، کے فوجیوں نے عوام پر کی۔ اس نے اس تحریک کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ ان ظالموں نے نہایت بیدردی اور سفاکی سے عوام کے گھر بار لوٹ لئے ان کے کھانے پینے کی اشیا برباد کر دیں۔ انہیں انتہائی ذلیل کیا اور سینکڑوں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو وسطی چین سے "طویل سفر" کرنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن عوام کے سینوں سے بھی لاوا ابل رہا تھا۔ انہوں نے اس وقت چیانگ کو اس کے برہنہ روپ میں دیکھا تھا: وہ مایوس نہیں تھے۔ بلکہ ان کے اندر استقلال اور ثابت قدمی اور پختہ ہو گئی تھی۔

"ماؤ زے تنگ" نے اپنی ایک نظم میں اس "طویل سفر" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

"سرخ فوج میں طویل سفر کی تکلیفوں سے کوئی خوف زدہ نہیں تھا۔

ہم ہزار چوٹیوں اور دس ہزار دریاؤں کو خاطر میں نہیں لائے۔

پانچ پہاڑ موجوں کی طرح اٹھے اور موجوں کی طرح غائب ہو گئے۔

وو لیانگ، کے پہاڑ ہماری نظروں میں ہرے سنگریزوں سے زیادہ نہیں تھے۔

جو لوگ اس پختگی اور کڑے تیوروں کے ساتھ اٹھے ہوں اور انہیں شکست دے دینا آسان کام نہیں تھا۔ ان کے پاس جذبہ تھا، جوش تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ان کے اندر سچا خلوص تھا۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے وطن کو اس مصیبت سے نجات دلانا ہمارا فرض ہے۔ اور اپنے اس فرض کو فراموش کر دینا نہیں چاہتے تھے۔

انتہائی ظلم و ستم کے باوجود ان کی تحریک روز بروز عظیم چین میں پھیلتی ہی چلی گئی۔ اس سرے سے اس سرے تک تمام لوگوں نے ان کی آواز سنی اور اس پر لبیک کہا۔ عوام کے اندر احساس کی پاکیزگی، عزم کی پختگی اور کامیابی کا یقین پختہ سے پختہ تر ہوتے چلے گئے۔ اب وہ بڑی پامردی کے ساتھ حکومت سے ٹکر لینے کو تیار تھے۔

اور ۱۹۳۶ء میں نہایت دلیری سے انہوں نے چیانگ کائی شیک کو اڑا لیا۔ تو بڑی گڑبڑ مچی۔ لیکن حکومت نے ادھر تو ظلم و ستم کو کچھ روکا اور ادھر سمجھوتہ کی بات چیت کی۔ اور آخرکار چار شرطوں پر اسے چھوڑ دیا گیا وہ شرطیں یہ تھیں۔

(۱) جاپان کے خلاف جنگ کی جائے۔

(۲) خانہ جنگی روکی جائے۔

(۳) جاپانیوں کے مخالف سیاسی قیدیوں کو چھوڑا جائے۔

(۴) عوام کے شہری حقوق تسلیم کئے جائیں۔

کچھ دنوں۔ — جب تک چیانگ کو اپنا اور اپنی حکومت کا فائدہ نظر آیا اس وقت تک تو سمجھوتہ قائم رہا۔ ۱۹۳۷ء میں دونوں نے مل کر جاپان کے خلاف جنگ کی۔ لیکن وقت ختم ہو جانے پر — ۱۹۴۵ء کے بعد۔ چیانگ نے پھر وہی حرکت شروع کر دی۔ وہی ظلم و زیادتی اور غیر ملکی سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ وہی عوامی تحریک کو کچلنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

آخرکار ۱۹۴۷ء میں کمیونسٹوں کو اپنی حکومت کا اعلان کرنا پڑا — اور اس کے بعد سے عوامی تحریک نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا اب چیانگ سے صلح و معاہدہ کی ضرورت کوئی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب انہوں نے آگے ہی قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ جس طرف بڑھتے۔ ان کے سامنے دریا اور پہاڑ اپنی شکست تسلیم کر لیتے۔ ان کے قدم جس سرزمین پر پڑتے اس جگہ بیل بوٹے درخت کھیت، اونچے محل، نیچے جھونپڑے سب ان کے آگے سر جھکا دیتے۔ اور عوام تو بے چینی سے ان کا انتظار کرتے ہی رہتے تھے۔ ان کے دروازے عوامی فوج کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ کومن تانگ، کے فوجی ہزاروں کو گولی سے اڑاتے لاکھوں کو جیلوں میں ٹھونستے سڑکوں پر گھسیٹتے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں ہر وقت عوامی فوج کی راہ تکتی رہتی تھیں۔ ان کے کان ہر وقت خوشخبری سننے کے لئے باہر کی آوازوں پر لگے رہتے تھے۔ ان کے دل ایک طرف تو حکومت کے خوف سے کانپتے رہتے تھے دوسری طرف ان میں ہلکی سی خوشی کی لہر بھی دوڑتی رہتی تھی۔ ایک طرف تو ان کے دل اس ڈر سے دھڑکتے ہوتے تھے کہ کہیں کومن تانگ کے وحشی عوامی فوج کی مزاحمت نہ کریں۔ اور دوسری طرف ان کا یقین انہیں تسلی دیتا ہوتا تھا۔ جب وہ سنتے کہ عوامی فوج قریب آ گئی ہے۔ تو ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ ان کے اندر ایک جوش پیدا ہو جاتا اور جیسے ہی ان کے کانوں میں آواز آتی کہ عوامی فوج آ گئی تو وہ بے چین ہو کر ان کے استقبال کے لئے دوڑ پڑتے۔

اسی طرح عوامی فوج، عوامی طاقت کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ انہیں اپنی طاقت، — عوام کی طاقت اور خلوص پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں اپنی قوت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خلوص اور سچائی کے سامنے کوئی جھوٹی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔ اور وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن نانکنگ کی سڑکیں اور شنگھائی کی اونچی عمارتیں ان کا استقبال کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

اب چاہے کتنے ہی چیانگ سچ مچ ہی کیوں نہ خودکشی کر لیں۔ اب کیسی ہی ناکہ بندی کیوں نہ کر دی جائے۔ اب امریکہ کے سینیٹر نئی حکومت تسلیم کریں یا نہ کریں۔ مگر چیانگ کے ۵۰ لاکھ مہینے تو بہت دور ہیں۔ چند ماہ میں ہی سارا چین عوام کے ہاتھوں میں ہوگا۔ !!

"ماؤزے تنگ" نے ایک مرتبہ کہا تھا: "نئی جمہوری تہذیب عوام کی تہذیب ہے۔ اسے محنت کش عوام مزدوروں اور کسانوں کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ جو کہ کل قوم کا نوّے فی صد حصہ ہیں۔ اس لئے انہیں کی تہذیب اور انہیں کا کلچر نئی جمہوریت میں ہونا چاہیئے۔"

اور وہ لوگ جہاں بھی گئے، انہوں نے اسی قول پر عمل کیا۔ وہ عوام کے لئے لڑ رہے تھے۔ لہٰذا عوام کو فائدہ پہنچانا ان کا اوّلیں فرض تھا، جسے انہوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ ادا کیا۔ اور عوام نے بھی اس کام میں ان کی انتہائی مدد کی۔

پی۔ ذراف نے "چین کے آزاد علاقوں کی تہذیبی ترقی" پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "چین کے آزاد علاقوں میں تعلیم اور کلچر کی زبردست ترقی ہوئی ہے۔ جمہوری حکومت اور کمیونسٹ پارٹی ان علاقوں میں بسنے والے عام لوگوں کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ نئے چین کے شہروں اور گاؤں میں جہاں جہالت کا دور دورہ تھا۔ وہاں اب متعدد اسکول اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر شانسی، کانسو وغیرہ علاقوں میں تین ہزار سے زیادہ اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ صوبہ کیانگسی کے علاقوں میں پچھلے ۲ برس کے دوران میں ۱۸۰۲۲ ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم ہوئے ہیں۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد ۲ لاکھ ۱۰ ہزار ہے۔ اس کے علاوہ ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لئے ۲۲۰۴ کلاسیں کھولی گئی ہیں۔ جن میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار بالغ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔"

"سکول قائم کرنے اور تعلیم کو ترقی دینے کے لئے آزاد علاقوں کے کسان مزدور جمہوری حکومت کو ہر طرح امداد بہم پہنچاتے ہیں۔ دیہات میں سکول کی رسم افتتاح پر بڑا جشن منایا جاتا ہے۔ مقامی حکام اور باشندے سکول کی ہر ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں۔ مدرسین کے آرام کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ گاؤں کے سکول ماسٹر کو صاف مکان رہنے کو ملتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیا مہیا کی جاتی ہیں۔ ایندھن دیا جاتا ہے۔ ایک قطعہ زمین بھی دیا جاتا ہے۔"

"چین کے آزاد علاقوں میں جمہوری حکومت اعلیٰ تعلیم پر بڑی توجہ کر رہی ہے۔ ینان میں ایک یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ، فنون کی ایک اکیڈیمی، قدرتی سائنس کی ایک اکیڈیمی، اور انتظامی عملہ کی تربیت کے لئے بھی اکیڈیمی قائم کر دی گئی ہے۔ شانسی، چاہار، ہوپے کے آزاد علاقوں میں ایک مشترکہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ دوسرے آزاد علاقوں میں متعدد اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً شانتنگ یونیورسٹی، کیانگ سو یونیورسٹی، تنگ پی یونیورسٹی، یانے شان آرٹس اکیڈیمی، فوجی و سیاسی اکیڈیمی ایک صنعتی انسٹی ٹیوٹ، ایک زراعتی انسٹی ٹیوٹ وغیرہ — ۱۹۴۸ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی۔"

آگے چل کر رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے متعلق وہ لکھتا ہے: "آزاد چین کے علاقوں میں بہت سے رسائل اور اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت بھی کافی وسیع ہے۔ مشہور اخبار "ذیفانگ زی پاؤ" جس میں تقریباً ۱۱۰۰ نامہ نگار ہیں۔ ینان سے شائع ہوتا ہے — اخبار "ہوآن شانگ پاؤ" کے بیان کے بموجب ۱۹۴۸ء میں آزاد چینی علاقوں سے ایک سو مختلف اخبارات شائع ہوئے ہیں جن میں "جی شی" (علم) با تصویر رسالہ "تنگ پی ہوا پاؤ"، شمالی مشرقی علاقہ کا ادبی رسالہ "تنگ پی دین پی"، "چین من ان یوئی" (عوامی موسیقی) قابلِ ذکر ہیں۔ تمام چینی اخبارات جدید چینی حروف تہجی استعمال کرتے ہیں جو چینی محنت کش عوام بآسانی سمجھ لیتے ہیں ...... آزاد علاقوں میں جمہوری تہذیب اور تعلیم کی ترقی نئے چین کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

یہ تو تعلیمی اعتبار سے چیزوں کی ترقی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے ان تمام چیزوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ مختلف کارخانوں اور صنعتی اداروں میں آپس میں مقابلے کے کام کرائے جاتے ہیں۔ جن میں کامیاب ہونے والوں کو تمغے اور "قائد محنت" کے خطاب دیئے جاتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں جلسے کئے جاتے ہیں۔ انہیں سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں — یوم مئی وغیرہ جیسے موقعوں پر بھی خطابوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ محنت کی تحریک کا پروگرام بنایا جاتا ہے۔ "مردہ لوہے کو زندہ کرو" کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ رسالے اور اخبار "تحریک محنت نمبر" نکالتے ہیں جن میں کامیاب ہونے والوں کے بڑے بڑے فوٹو شائع کئے جاتے ہیں —— اسی طرح آزاد چین نے اتنی جلدی صنعتی ترقی کر لی کہ وہ لوگ جو نا امید تھے۔ حیران رہ گئے ہیں

زراعتی ترقی بھی اسی طرح ہوئی۔ سب سے پہلے تو زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمین چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دی گئی۔ انہیں بتایا گیا ہے۔ کہ یہ سب تمہاری ہی ہے۔ تم اس پر جتنی محنت کرو گے اتنا ہی پھل پاؤ گے۔ عوام نے بھی اس کو محسوس کیا اور انہوں نے کٹھن محنت کر کے زمین سے سونا اگلوا لیا۔ آزاد علاقوں کی زمین کا چپہ چپہ کھیتوں سے لہلہانے لگا۔ بنجر زمین کا کہیں نام و نشان بھی نہیں رہا۔ کسانوں کو محنت مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، سب اپنی ہی بھلے کر رہے ہیں۔ جتنا کمائیں گے۔ اتنا کھائیں گے! اور یہی ترقی کا راستہ تھا۔

آج آزاد چین کی نئی زندگی نے ہر چیز کو نیا روپ دے دیا ہے۔ آج وہاں ہر اس ترقی پسند چیز کو جسے پہلے برا تصور کیا جاتا تھا۔ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ قدیم چین میں محنت ایک "ذلیل پیشہ" خیال کی جاتی تھی۔ امیر لوگ تو اپنے بچوں کو صرف تعلیم یافتہ بنانا ہی کافی سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں تو محنت نام کی کوئی شے ہی نہیں تھی۔ اور غریب لوگ بھی تعلیم کا تصور تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن محنت کو وہ بھی برا سمجھتے تھے۔ ان کی بھی آرزو ہوتی تھی۔ کہ ان کے بھی بچے پڑھ لکھ کر بابو بن جائیں اور اس ذلیل پیشے سے نجات پا جائیں۔

لیکن اب آزاد چین ایسے لوگوں کو جنم دے رہا ہے۔ عوام میں ایسا تخیل پیدا کر رہا ہے۔ جس سے تمام رجعت پسندانہ خیالات کا قلع قمع ہو جائے۔ اور ایک نئی زندگی، نیا سماج، نیا ماحول، نیا نقطۂ نظر پیدا ہو جس سے صرف چین ہی میں نہیں۔ تمام دنیا میں اور خاص کر تمام مشرق میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔

جاپانیوں کی شکست اور منچوریا کی آزادی کی دوسری سالگرہ پر ہاربن میں ایک نمائش ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر ایک بڑا بھاری جلوس "ڈیموکریٹک یوتھ لیگ" کے نوجوان مرد اور عورتوں نے نکالا تھا۔ یہ جلوس لائن بنا کر چل رہا تھا۔ سب سے پہلی لائن میں عوامی فوج کا ایک سپاہی اپنی رائفل لئے، ایک مزدور ہاتھ میں ہتھوڑا لئے، اور ایک کسان ہاتھ میں دھان کا گٹھا لئے مارچ کر رہے تھے۔ ان تینوں کی بغل میں ایک ایک کتاب تھی — وہ نئے چین کے زندہ نمونے تھے — وہ چین جو امریکی ڈالروں اور چیانگ کائی شیک کی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے۔ جس کا نعرہ ہے۔ "جنگ، محنت اور تعلیم!"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نیا چین امن عالم کی جد و جہد میں بھی نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ اور چین میں اس قسم کی ایک مستقل تنظیم قائم کئے جانے کی حمایت کر رہا ہے — امن عالم کانگریس میں چینی نمائندوں نے اس قسم کی ایک تجویز پیش کی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ چین کی تمام عوامی جماعتوں کے منتخبہ نمائندے اس طرح کی تنظیم قائم کرنے میں پہل کر رہے ہیں۔

اور — چینی وفد نے عہد کیا تھا کہ وہ تازہ جوش و خروش کے ساتھ چین میں مکمل انقلاب برپا کرنے کی جد و جہد کریں گے اور چین کو زراعتی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل کر دیں گے تاکہ وہ جلد سے جلد کمیونزم کے راستے پر گامزن ہو جائے۔"

یہ حقیقت ہے کہ آج کا چین ساری دنیا کے پسے اور کراہتے ہوئے غریب مزدوروں اور کسانوں کے لئے نوید مسرت بنتا جا رہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں، جب چین کا "کسان مزدور انقلاب"، دنیا کے بے کس اور بے بس عوام کی اندھی آنکھوں کو روشنی بخشے گا!! — زندہ باد نیا چین!!!

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۳)

کر رہا ہوں۔ اور عمر بھر اسے فن کو نکھارتا رہوں گا۔ سطحی طور پر سوچنے والے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اب فلاں ادیب لکھنے کے حق میں کامل ہو گیا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اس فن میں کبھی کوئی کامل نہیں ہوا۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی اچھے سے اچھا لکھنے والا، اس سے بھی بہتر لکھ سکتا ہو۔ اسے یقین ہے۔ کہ خود اس نے محنت اور استقلال سے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور ہر چیز کو رد کر دیا ہے۔ جو اسے اپنی معیار سے کم نظر آئی ہے۔

وہ کہتا ہے۔ لکھنا ایک آزمائشی مقابلہ ہے۔ جس میں ہم اپنی تگ و دو کے علاوہ کسی بھی سفارش پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ معمولی سے معمولی درجے کا ادیب بھی "نہ قومی" ادیب ہوتا ہے، "نہ امریکی" ادیب، نہ "انقلابی" ادیب غرضیکہ وہ صرف "ادیب" ہوتا ہے اور اسی وسیع میدان میں اسے اپنے جوہر دکھانا ہوتے ہیں۔ امتحان ایک معیاری مقابلہ ہے۔ ہاں کہیں کہیں ماحول ذرا تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر ناسازگار کہیں نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے معمولی حادثے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہر شخص کو اپنی سرنوشت کو کوشش کرنا ہوتی ہے۔ اگر وہ کوشش کر سکتا ہے۔ تو کامیاب ہو گا۔ اگر نہیں تو پھر اسے لکھنا چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ کہنا کہ ماحول سازگار نہیں، مواقع اچھے نہیں ملے، فضول ہے۔ یا تو کوئی شخص ادیب بن سکتا ہے۔ یا نہیں بن سکتا۔ صرف یہی دو صورتیں ممکن ہیں۔

ایک مطالعہ

ریاض جاوید

شفیق الرحمٰن

ہمارے افسانہ نگاروں میں اکثریت اُن نوجوانوں کی ہے، جن کا ادبی شعور زیادہ تر مریضانہ قسم کی رومان پسندی کا مرہونِ منت ہے۔ اور وہ اپنی ذات کی محدود دنیا کی اور نہایت فرسودہ نظریات پر اپنا فن ابھارنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے اکثر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس ترجمانی کا انداز غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر کچھ ایسا ہی تاثر انسان پر ہوتا ہے ــــ اسکے ہر افسانے میں "ہیرو" اور ماحول میں یکسانیت پائی جاتی ہے شفیق المعانی کا مثالی ہیرو، ہماری فلموں کے روایتی ہیرو کی طرح، خوبرو، طویل قامت، خوش پوش اور خوش گفتار ہوتا ہے۔ اور اونچے متوسط طبقہ کی تعلیم یافتہ لڑکیوں سے عشق لڑانا اس کا مشغلہ ہے۔ لڑکیوں کو متوجہ کرنے کے لئے، شفیق کا ہیرو کبھی مکہ بازی میں اوّل نظر آتا ہے۔ کبھی پیراکی میں نمایاں درجہ حاصل کرتا ہے اور کرکٹ تو اسکے نزدیک "عشق بازی" سے بھی اہم ہے۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ کم سے کم ہمارے ادب میں ایک ایسا افسانہ نگار تو ہے۔ جس کے نزدیک زندگی کرکٹ کی گیند اور حسین لڑکی کے درمیان لڑھکتی رہتی ہے۔ اور اسے دیگر مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ بظاہر افسانہ نگار کا یہ نظریہ کافی صحت مند معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح زندگی کے مصائب اور الجھنوں سے تھکے ہارے اذہان پل بھر کیلئے "تفریح" حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ایک عامیانہ فلم کی طرح یہ افسانے تفریح کے ساتھ ساتھ ایک اور الجھن بھی پیدا کرتے ہیں کہ آخر بیسویں صدی میں شہزادوں اور پریوں کے نام اور ماحول بدل کر ایسے بے سروپا قصّے لکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے لئے ہمیں افسانہ نگار کے ماحول اور طبقے کا تجزیہ کرنا پڑیگا۔ کیونکہ کوئی ادیب اپنے خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا! اور نہ اپنے طبقے کی حدود سے باہر نکل سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معاشی طبقے کی ترجمانی غیر شعوری طور پر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ وہ اونچے متوسط طبقہ کا نظریۂ ادب ہے۔ چونکہ شفیق صاحب اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ طبقہ ادب کو تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے ــــ اس لئے ان کے تمام افسانے اپنے طبقے کے ذہنی رجحانات کو پوری دیانتداری سے پیش کرتے ہیں۔

یہ طبقہ جب اپنے ماحول کی یکسانیت سے اُکتا کر تنوّع پیدا کرنا چاہتا ہے، تو اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر شام کو کوئی دل پسند فلم، یا کوئی پارٹی یا کسی کھیل کے مقابلے کا پروگرام نہ ہوا۔ یا اُس وقت جنسی رجحانات کی تسکین کا بھی کوئی سامان نہ ہوا، تو پھر وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے فالتو اوقات ادب کی "سرپرستی" میں گزارتا ہے۔ لہذا اس طبقہ کے لئے ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے جو کم از کم اس کے رومانی جذبات ہیں، جو زندگی کی غلط اقدار اور معاشی غلامی کے سبب روپیہ کی جھنکار کے نیچے دبے ہوتے ہیں۔ بذرا سا تغیر پیدا کر دے اور بس ــــ یہ تنوّع "ذہنی حرکت" جنسی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جنس کے معاملہ میں وہ اتنا بھوکا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بھوک صرف جذباتِ لطیف تک محدود ہے۔ جو اونچے متوسط طبقے میں روز بروز مفقود ہو رہے ہیں۔ اور ایسے ادب میں "تفریح" کا جزو بھی کافی مقدار میں شامل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حکمران طبقے کے مقابلے میں یہ طبقہ جس احساسِ کمتری کا شکار ہے اسے وقتی طور پر ہنسی ہنسی میں مدغم کیا جا سکے۔

اس طبقے کو ایک چیز سے انتہائی نفرت بلکہ کوفت ہوتی ہے۔ وہ ہے "حقیقت" — اگر اس طبقے کے لوگوں کو انفرادی لحاظ سے بھی زندگی کے حقائق کا علم ہو جائے۔ تو ان کی زندگی کی بے بسی اور بے چارگی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے — لہٰذا اس طبقے کی مجموعی لحاظ سے یہی کوشش رہتی ہے کہ زندگی کی موجودہ غلط اقدار کے خلاف آواز ہی نہ اٹھائی جائے۔ اسی طبقے کی ایک افسانہ نگار خاتون شفیق الرحمٰن کے "مدوجزر" پہ یوں تحریر فرماتی ہیں:-

"شفیق الرحمٰن صاحب کے افسانے ہمارے جدید ادب میں اس لحاظ سے بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ کہ وہ ان مخصوص مسائل سے پاک اور مبرا ہیں جنہیں آجکل تر پالابس افسانوں میں پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے بار بار ان مسائل کی یہ صورت بن چکی ہے کہ افسانہ نگار مسائل کا مخلصانہ اور شدید احساس پیدا نہیں کر رہا۔ بلکہ جلد توجہ حاصل کرنے اور فوراً ادیب کہلانے کیلئے چند مسائل پر لکھنے کا دستور عام ہو چکا ہے۔ باتوں کی آمد نہیں آورد ہے۔ تاریک سے تاریک کونے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں باہر لائی جارہی ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ دھچکا لگا سکیں۔ جن مسائل پر لکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں۔ جن پر شفیق الرحمٰن صاحب بحیثیت ایک ڈاکٹر کے اظہار خیال کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اور اعتماد بھی۔ لیکن انہوں نے اپنا دامن بہ احتیاط اس روش سے بچایا ہے۔ جو باوجود پرانی نہ ہونے کے عامیانہ سی بن چکی ہے۔" (حجاب امتیاز علی)

کرنیں — دیباچہ صفحہ ۱۰-۱۱

اس طبقے کی ذہنی افتاد کا تقاضہ ہے۔ کہ وہ حقیقت سے کنارہ کش ہو۔ اور ایک ایسا حسین اور رنگ سا خیالی محل بنائے۔ جہاں وہ ذہنی طور پہ اپنی زندگی کے کھوکھلا پن، تضاد اور تصنع سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ اسے حقیقت یا زندگی کے ٹھوس پہلوؤں کو دیکھنے سے وحشت ہوتی ہے۔ دراصل اس طبقے کو زندگی کے بنیادی مسائل سے ہی چڑ ہے اور یہ کہنا کہ "مخلصانہ اور شدید احساس" پیدا نہیں ہوتا۔ تو وہ اس طبقے کی محدود ذہنیت میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کا کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا!! افراد کی اپنی زندگی، انکا طبقاتی تمدن، ان کا اخلاق، ان کی تعلیم جہاں تک کہ ان کی محفلیں مستعار ہوتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ماضی کی جن روایات پہ وہ اپنی زندگی کا نصب العین تعمیر کرتے ہیں۔ وہ اتنا فرسودہ اور بے جان ہو چکا ہے۔ کہ اس پر کسی نئی تعمیر کا امکان نہیں رہا۔

اس طبقے کے فرد کی ذہنیت نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی فرد کی ذہنیت سے بالکل مختلف ہے۔ جب متوسط طبقے کا ایک حساس اور ذہین شخص اس ہنگامہ خیز زندگی میں طبقاتی کشمکش کو پوری شدت سے محسوس کرتا ہے۔ تو معاشی لحاظ سے وہ محنت کش یا ادنے طبقے کی طرف راغب ہوتا ہے اور اپنے سے بلند طبقے سے جلتا ہے۔ لیکن وہ ہوتا ہے، سرمایہ پرست ذہنیت کا شکار اور اس کی تمام تر کوشش سرمایہ دار طبقے میں شامل ہونے پر مرکوز ہوتی ہے اور جب اس طبقاتی کشمکش میں اسے اپنی کم مائیگی اور غیر اہم حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ محنت کش طبقے کی تاریخی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف جھکنے لگتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اسے طبقاتی تعلیم اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہمارے اکثر ادیبوں میں سرے سے ہی ناپید ہے۔ لیکن یہ اونچے متوسط طبقہ کے افراد ایک ذہنی اور اعصابی کمزوری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کا تجزیہ فرائڈ کے نظریات کے تحت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس طبقے کی زندگی کا دارومدار معاشی طبقہ بندی ہے اور معاشی لحاظ سے یہ عام متوسط درجے سے قدرے مضبوط لیکن ذہنی طور پہ زیادہ

سرمایہ پرست ہوتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ان کی زندگی میں کوئی نظریہ حیات یا زندگی کا واضح مفہوم نہیں ملتا ——— تضاد ——— ان کی ہر حرکت، ان کے ذہن کی ہر افتاد اور اُن کی تنظیم کے ہر پہلو میں مکمل تضاد موجود ہے ——— اس لئے جن کا نظریہ حیات مبہم اور فرسودہ روایتی اقدار پر مبنی ہو۔ وہ ادب میں کیونکر صحت مند نظریہ پیش کر سکتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس طبقے کی اہمیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ حکمران طبقے میں مدغم ہو رہا ہے۔ لہٰذا ان کا اثر ادب پر پڑنا ناگزیر تھا۔ اور ہمارے متوسط طبقے کے ادیب جو ذہنی طور پر حکمران طبقے کی ثقافتی اقدار کو جزو حیات کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ آج اعلانیہ ایسے ادب کی حمایت کرتے ہیں جس کا کوئی واضح اصول نہ ہو۔ بلکہ جس میں حقیقت کا شائبہ تک نہ ہو۔ وہ حقیقت جو اس ناجائز طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے درپے ہو۔ بلکہ ایسے ادیب اُس رومانی انداز پر مصر ہیں۔ جس میں جدید نظریہ جنس بھی شامل ہو جسے ہم الف لیلے کا بیسویں صدی کا اڈیشن ہی کہہ سکیں۔

اس طبقے کے ادیب جناب امتیاز علی۔ امتیاز علی تاج۔ شفیق الرحمٰن۔ ایم اسلم۔ رئیس احمد جعفری۔ میاں بشیر احمد۔ رشید اختر ندوی اور نسیم حجازی ہیں۔ اور اس گروہ میں محمد حسن عسکری۔ ممتاز شیریں، جاوید اقبال کا اضافہ ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان ادیبوں کی اکثریت ترقی پسند تحریک کی دشمن تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ان کو حکومت کی "مصلحت کوشی" کی آڑ مل گئی ہے اور وہ اب اجتماعی زندگی کی ترقی و بہبود کو حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر ادب کو مبہم تصورات کا آئینہ بردار بنانا چاہتے ہیں۔

جب تک غیر ملکی حکومت تھی۔ تو یہ اونچا طبقہ متوسط معاشی لحاظ سے ترقی پسند تحریک کا اتنا دشمن اور خلاف نہ تھا۔ کیونکہ ملک کی اجتماعی زندگی کے ارتقائی عمل میں انہیں ہمارا ساتھ دینا تھا اور چونکہ آج یہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکا ہے۔ اور ہمیں تو منزل کچھ دور ہی نظر آتی ہے۔ اس لئے اب مخالفت محض ادبی قسم کی نہیں۔ بلکہ بوسیدہ اور جدید۔ نئے اور پرانے طریقہ زندگی میں ایک کشمکش کارفرما ہے۔

اور اس کشمکش میں رجعت پسند ادیبوں کی پشت پناہی حکومت کر رہی ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کو اپنے صالح مقاصد اور بے پناہ قوت حیات پر یقین کامل ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ فتح ترقی کی ہوگی۔ زندگی برابر بڑھتی رہے گی۔ رجعت پسند ادیب ماضی کے اُن فرسودہ اوراق میں مدغم ہو جائیں گے۔ جہاں ان سے پہلے ہزاروں ادیب اور فن کار ختم ہو چکے ہیں۔

لیکن اب اپنے معاشی طبقے کی ذہنیت سے مجبور، یہ کوئی ایسی تحریک پسند نہیں کرتے۔ جس میں حقیقت ہو۔ یا جس میں ہماری اجتماعی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔ اور یہ کوئی ایسی تحریر بھی پسند نہیں کرینگے۔ جس میں طبقاتی تقسیم کو غلط اور غیر منصفانہ ثابت کیا گیا ہو۔ زندگی کا یہ مسئلہ کوئی جذباتی یا وقتی نہیں۔ بلکہ ماضی اور مستقبل کی جنگ ہے۔ جس میں وہ تمام نظریات جن پر موجودہ سماج کی بنیاد کھڑی ہے۔ اور خصوصاً یہ طبقاتی تقسیم جس کو یہ حکمران اور اس سے ملحق سرمایہ پرست طبقہ اجتماعی زندگی کا منطقی عمل سمجھتے ہیں۔ اور اس کے جواز میں قوم، تمدن اور مذہب کے نظریات پیش کرتے ہیں۔ اور تمام مادی مسائل کی بنیاد روح یا روحانیات پر رکھتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ کہ یہ مذہب کی روایات اور نظریات کو اپنی منشأ اور اپنے مادی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ تو زندگی کے علمبرداروں کو ملک و قوم کا ہی دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ کہ جب بھی فرسودہ روایات اور زندگی کی غلط اقدار کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ تو حکمرانوں نے ایسی ہی الزام تراشی سے کام لیا ——— مسلمانوں کی ہی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت اپنی تمام تر تلخی کے ساتھ عیاں ہوتی ہے۔ کہ بغداد میں خلافتوں کے زمانہ میں "ترقی پسند" عناصر کے خلاف حکمرانوں کی جدوجہد پورے عروج پر ہوتی تھی جس ترقی پسند مسلمان نے خلیفہ وقت کے استبداد اور آمریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ "کافر" کا فتوےٰ دیکر اس کا سر اڑا دیا گیا۔ آج بھی حکمران طبقہ کے اس قسم کے رویہ سے ترقی اور فلاح کے علمبردار کیسے گھبرا سکتے ہیں۔ وہ اپنا تاریخی کردار پورا کر رہے ہیں اور ہم اپنا ———

ہمارا حکمران طبقہ جس قسم کے ادب کی تخلیق چاہتا ہے۔ اس کی مثال شفیق الرحمٰن کے افسانے پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں کا کوئی کردار حقیقت کا حامل نہیں۔ بلکہ ایک ہی محور پر گھومتا نظر آتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک اور مفید اور کارآمد حربہ زبردستی کا مزاح ہے۔ ایسے مزاح کے مصنف پر شوکت تھانوی

بھی ڈٹے ہوئے ہیں، یعنی ہنسانے کی کوشش —— وہ ہنسی جس کا منبع انسانی فطرت کی مسرت نہیں۔ بلکہ قوت بہ زور دیگر ہنسانے کی کوشش ہے۔ ان کے نزدیک بیوقوفی اور دیوانہ پن کا دوسرا نام "مزاح" ہے۔ اس قسم کا مزاح ہمیں "سماج" "یونہی" "مشورے" اور "شیطان" میں ملتا ہے۔

اس کے علاوہ اُس طبقہ کا تصورِ حیات شفیق الرحمٰن کی زبانی سنیئے!

"دراصل یہ دنیا نہ تو غمکدہ ہے۔ اور نہ راحت کدہ نہ یہاں رنج بٹتے ہیں اور نہ خوشیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ نہ یہ ایک عذاب ہے۔ اور نہ دلکش سپنا یہ تو ایک خلا ہے۔ ایک وسیع خلا —— جس میں بذاتِ خود زندگی کا نام و نشان تک نہیں —— یہاں ہمارا دل نور کا منبع ہے۔ اسی کی جلا سے ہماری روح روشن ہے۔ اسی سے ہماری آنکھوں میں یہ تر و تازگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ جب تک یہ شمع جلتی رہتی ہے۔ ساری دنیا منور اور مسرور نظر آتی ہے۔ یہ چاند سورج ستارے سب ہماری اپنی روشنی سے نظر آتے ہیں۔ اور جس روز یہ شمع بجھ جائے گی تو چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تب قدرت کا یہ کھیل کس قدر بے معنی اور بے رنگ و بو لگتا ہے۔ اور دل کے نور کے ساتھ روح کی جولانی اور آنکھوں کی شگفتگی بھی ختم ہو جاتی ہے —— "

مد و جزر ۔ صفحہ ۱۶۶

یہ ہے وہ تصورِ حیات جس کی مبہم کیفیات پر یہ ادب اور فن کا قصرِ عظیم کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ انتہائی درجہ کی خود غرضی اور خود پسندی جسے انسانیت کے ہمہ گیر اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنے "دل" کو اس دنیا اور زندگی کا محور اور منبع بنانا۔ تاریخ کا وہ سب سے بڑا فریب، دھوکہ اور جھوٹ ہے۔ جو انسان کو کبھی بھیڑیا اور کبھی گدا کر بنا کر چھوڑتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اٹھائیے۔ آپ پر پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ کہ یہ دل یا روح کو دنیا ماننے والوں نے اپنی نسلوں کو ایک ایسی دردناک غلامی سونپی۔ جو بیک وقت روحانی اور جسمانی تھی۔ اور موجودہ زمانہ میں یہ فلسفہ حیات ایک طرف سرمایہ دار حکمران کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف محنت کش کو قرونِ وسطےٰ کی غلامی پر قناعت کرنے کو کہتا ہے۔

شفیق الرحمٰن، جو اس سرمایہ پرست طبقہ کے نمائندہ ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو ایک ہشاش بشاش بلکہ خوش باش ادیب کے روپ میں پیش کرتے ہیں وہ غیر شعوری طور پر وہ رجعت پسند فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ جس کی رُو سے حقیقت کو ہمیشہ واہمہ سمجھا گیا اور کوئی حقیقت پسند اور معقول ذہن جھٹلا نہیں سکتا کہ ایک فرد سے دنیا نہ مرتی ہے نہ زندہ رہتی ہے۔ ایک فرد یا ذرّہ اس دنیا کا جزو تو ہے۔ لیکن یہ دنیا، یہ ہمہ گیر زندگی اس جزو یا فرد سے بیک وقت آزاد بھی ہے اور خود مختار بھی —— ایک فرد سے بڑھ کر لاتعداد افراد کے اجتماع کا نام زندگی ہے۔ اور اس اجتماع جو کبھی قبیلہ، کبھی گروہ، کبھی جماعت اور کبھی قوم یا پھر ملک بن گیا۔ انسان کے عروج کے مختلف مدارج ہیں۔ فرد —— اس اجتماع کے بغیر کچھ بھی نہیں —— اور اس اجتماع کی مسلسل کوششوں سے موجودہ تمدن اور تہذیب کا ظہور ہوا۔ انسان کو اس اجتماع، اس اتحاد کے لئے اس کی مادی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں۔ اور تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے۔ اور یہی سب سے اہم اور بنیادی فلسفہ ہے —— اس کے برعکس انسان کی اس برادری کی اہمیت یا اسکے محرک کو فراموش کر کے روح یا وجدان کو زندگی کا منبع سمجھنا رجعت پسندی بلکہ فریب ہے۔ اور آج اس رجعت پسند فلسفہ یا اس قسم کے وجدانی نظریات کو اصول اور مقصدِ حیات تصور کرنے والے اس اجتماع کی ترقی میں سدِّ راہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عوام کی اہمیت سے روگردانی کر رہے ہیں۔

چنانچہ آج کا ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کے اس اہم مسئلے پر اظہارِ خیال کر رہا ہے۔ اور ادب میں زندگی کے ان دو متضاد فلسفوں

کے ماننے والوں کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ روح کو زندگی کا منبع گردانتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی کی موجودہ اقدار کو مشیت ایزدی تصور کرتا ہے۔ لہذا عوام کی جد وجہد زندگی سے ایسے ادیبوں کو کوئی سروکار نہیں۔ اور اسی طبقہ سے شفیق الرحمان تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ اپنی "زبردستی" کی مسکراہٹوں اور رومانی انداز کے باوجود رجعت پسند ہیں۔ بلکہ گمراہ کن — یہ زندگی کی جولانیاں اور مدوجزر نہیں جانتے۔ لہذا ایسے ادیب اس فرسودہ اور گلے سڑے نظریہ حیات یا نظریہ ادب سے زندہ ادب میں کوئی مستقل جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔

ادیبوں کا دوسرا طبقہ اس طبقاتی تقسیم اور سرمایہ دار طبقہ کے غلط منصب کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ ایسے ادیبوں کا نظریہ حیات انفرادی، رومانی یا وجدانی نہیں۔ بلکہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اور یہ محنت کش طبقے کی کلیدی حیثیت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کا یقین ہے کہ تمام انسانیت کی فلاح و بہبود اسی طبقے کے برسر اقتدار آنے سے وابستہ ہے۔ لہذا یہ ایک انقلابی پیغام کے حامل ہیں اور ان کی کامیابی یقینی ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

احمد ندیم قاسمی

غزل

اُفق نہاں ہے تو حدِّ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں، سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں
مُہبت بلند ہے فردوس، گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی ذوقِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں، برگ و بر کا ذکر کریں

بہاؤ تیز ہے — ساحل تو جھلملاتا ہے
سفر دراز ہے — عزمِ سفر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضورِ فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے، اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چُنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگذر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بے چارگی ہے چارہ گری
تو کس اُمید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کٹے چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری، بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیمؔ! مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

غلام ربّانی تاباں

غزل

اشک وہی جو تارا بن کر پلکوں پر تھرّاتا ہے
درد وہی جو میٹھے میٹھے گیتوں میں ڈھل جاتا ہے

رنگِ حیا میں ڈوبے عارض پر یوں زلفیں بکھری ہیں
شام کی گہری چھاؤں میں جیسے کوئی کنول کھل جاتا ہے

کتنی مدت گزری اُن سے ربطِ تمنّا ٹوٹ چکا
سامنے اب بھی آتے ہیں جب دھک سے جی ہو جاتا ہے

میں تو اک آوارہ شاعر ہوش و خرد سے بیگانہ
کوئی اہلِ ہوش و خرد پھر میرے مُنہ کیوں آتا ہے

خونِ انجم میں جب شامل خونِ تمنّا ہوتا ہے
صبح کا رنگیں دامن جیسے رنگیں تر ہو جاتا ہے

تنہائی کی راتوں میں میں اکثر سوچا کرتا ہوں
پھولوں کا رُومانی موسم ایسے میں کیوں آتا ہے

ایک وہ لمحہ جس نے تاباںؔ زیست کا دھارا موڑ دیا
میٹھے میٹھے سپنے بن کر نظروں میں لہراتا ہے

طفیل

غزل

طلسمِ ظلمت کے ٹوٹنے سے تجلیوں نے افق کو گھیرا
ہماری شامِ الم کا لیکن نہ آج تک ہو سکا سویرا

طلوعِ خورشید کی چمک سے نہ چھٹ سکے ظلمتوں کے بادل
سحر نے آکر فضا کے دامن پہ چاند تاروں کا خوں بکھیرا

کہاں ہیں وہ سامنے تو آئیں جو کہہ رہے تھے سحر ہوئی ہے
محیطِ عالم کی وسعتوں پر وہی دھندلکے وہی اندھیرا

وہی تامّل وہی تغافل وہی تعیّش، وہی تساہل
ہوائے عالم کا رُخ بدل کر مری سیاست نے رُخ نہ پھیرا

سحر کی خاطر نہ جانے کتنے حسین تاروں کا خوں ہوا ہے
وہی حوادث وہی مصائب فلک کی گردش نے رُخ نہ پھیرا

چمن کا ماحول جل رہا ہے فضائے گلشن سُلگ رہی ہے
شجر شجر بجلیوں کا مسکن کہاں کریں جا کے ہم بسیرا

چمن چمن کی روش روش پر خزاں نہ ہو کس طرح مسلّط
ہر اک محافظ شریف ڈاکو، ہر اک محافظ حسین لٹیرا

بُجھی بُجھی کائنات کیوں ہے گھٹی گھٹی سی حیات کیوں ہے
قصور کس کا، قصور اپنا۔ قصور تیرا قصور میرا

زبانِ تنقید کو نہ خاموش کر سکے گی ستم شعاری
غلط سیاست کو بزمِ ہستی سے کوچ کرنا پڑے گا ڈیرا

نقاب اوڑھے ہوئے خضر کا نہ رہزنی کر سکیں گے رہبر
ہم اپنے ہاتھوں میں لے کے اٹھے ہیں عدل و انصاف کا پھریرا

احمد ظفر

دو غزلیں

یہ بیاباں کہاں وہ گلستاں کہاں یہ خزائیں کہاں، وہ بہاریں کہاں
تیری قربت کے لمحے گذر تو گئے تیری فرقت کے لمحے گذاریں کہاں

دل کے صحرا میں طوفان سے آگئے زندگی پر بگولے سے لہرا گئے!!!
کوئی ہمدم نہیں کوئی مونس نہیں کوئی ہو بھی تو اس کو پکاریں کہاں

ہر طرف مکر نے جال پھیلا دیئے ہر نظر پر ہوسناکیاں چھا گئیں
سوچتے ہیں فلک سے زمیں پہ تمہیں ہم اتاریں تو آخر اتاریں کہاں

مانتا ہوں کہ آغازِ گل بار ہے اپنے انجام کو بھی ظفر سوچ لو
زندگی کا چمن ہے خزاں آشنا زندگی کے چمن میں بہاریں کہاں

●

سُلطان مسرور

وقت منزل بہ منزل بڑھے جا رہا ہے مگر تو ابھی تک پرستارِ اوہام ہے
اس تری کم نگاہی نے تجھ کو ڈبویا سمجھتا رہا زندگی گردشِ جام ہے

ان سیہ گیسوؤں کی گھنی تیرگی سے گریزاں رہو چاہتے ہو اگر زندگی
یہ اندھیرا، اندھیرا نہیں نیند ہے اور پھر نیند بھی موت کا دوسرا نام ہے

کوئی تازہ فسوں ہم پہ کیا چل سکے گا کہ اس صبحِ نو کی حقیقت عیاں ہو چکی
جس کا آغاز تھا اک فریبِ تبسّم مگر خوں میں لتھڑا ہوا آردئے جام ہے

آسمانوں کا دل چیر سکتی ہے اس کو زمانہ سمجھتا رہے لاکھ کم مایئگی
مصلحت ہے جو چُپ ہے مگر قلبِ ذرّات میں انتقامات کا ایک کہرام ہے

ساتھیو! اپنی منزل کی جانب یونہی بجلیوں کی سی رفتار سے تم لپکتے رہو!
کامیابی قدمبوس ہونے کو ہے کچھ دنوں کا ہی مہمان اب دورِ آلام ہے

ابراہیم جلیس

ماؤنٹ بیٹن

درزی رحمان خاں شہر کے خوش پوش لوگوں اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت مشہور تھا۔ نئی نئی وضع کے سوٹ، شلوار، قمیص، بش شرٹ وغیرہ سینے میں سارے لدھیانے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا، اپنے کام میں بڑا محنتی، جفاکش اور ایماندار آدمی تھا۔ اکثر لوگوں کا تو وہ ناپ بھی نہیں لیتا تھا بہت سوں کے ناپ تو اسے ازبر یاد تھے۔ ایک جھلملتی ہوئی نگاہ گاہک پر ڈالی اور اپنے جونیئر کو ناپ لکھوانے لگا۔ لکھو بھئی۔ سینہ ۳۴۔ کمر ۲۹ شولڈر ۵ء۳ کالر ۱۳ ....

پہلے پہل جب اس نے لدھیانے میں درزی کا کام شروع کیا۔ تو شہر کے بڑے بڑے ٹیلر ماسٹروں نے اسے جیسے یہ کام چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ تھا اپنی دھن کا پکا۔ ایک دن چپ چاپ بمبئی چلا گیا۔ وہاں بمبئی میں اپالو بندر کے سلیمان چیمبرس کے گراؤنڈ فلور پر اسی کے شہر کے چند درزی بڑی آمدنی سے اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ رحمان ان کے ہاں نوکر ہو گیا۔ اور بڑی محنت سے کام سیکھنے لگا۔ بمبئی تو فیشن کا شہر ہے۔ روز روز نئے فیشن کے کپڑے سلنے آتے تھے۔ رحمان نے اپنی رات دن کی محنت سے ایسا کام سیکھا کہ اس ٹیلرنگ فرم کا مالک حیران رہ گیا اور پھر ماہ بماہ اس کی تنخواہ بڑھانے لگا۔ تنخواہ کے علاوہ منافع میں بھی اسے حصہ ملنے لگا۔ جب رحمان کے پاس ایک سال کے عرصے میں گیارہ سو روپے جمع ہو گئے تو ایک دن اس کا جی چاہا۔ کہ لدھیانے کا ذرا ایک چکر لگا آئے۔ یونہی تفریحاً۔ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور یار دوستوں پر رعب پڑ جائیگا۔ کہ بمبئی جا کر رحمان بڑا سیٹھ بن گیا ہے۔ اور یوں بھی وطن چھوڑے ایک سال گزر گیا تھا۔

لدھیانہ پہنچ کر اسے لدھیانہ بمبئی سے بھی زیادہ اچھا بمبئی سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوا۔ حالانکہ وہ بچپن سے لدھیانے میں رہتا آیا تھا۔ لدھیانے اور بمبئی کا آخر کیا مقابلہ۔ لدھیانہ وطن ہونے کے باوجود اسے پسند نہ تھا۔ جہاں وہ ایک غریب ماں باپ کے چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوا بڑی تنگی اور مصیبت کی زندگی گزارتا رہا۔ بڑا ہو کر درزی کا کام سیکھنے کے باوجود بھوکوں مرتا رہا۔ اسی لئے اُسے لدھیانے سے نفرت ہو گئی تھی اور اسی لئے وہ بمبئی بھاگ گیا تھا!

مگر اب بمبئی سے آنے کے بعد لدھیانہ یک بیک اسے بڑا پیارا شہر محسوس ہوا ——— اس کے اس احساس میں جذبہ حب الوطنی کو نام کا بھی دخل نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان گیارہ سو روپیوں کا اعجاز تھا۔ جس نے برسوں کے تلخ تجربے کو باطل کر کے لدھیانے کی گلی گلی کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ دراصل اس زمین پر کوئی جگہ بذاتِ خود نہ خوبصورت ہے اور نہ بے ڈھنگی ——— یہ صرف روپے کی کرامت ہے۔ اگر جیب میں روپے ہوں تو لدھیانے کی اجاڑ سب تحصیل جگراؤں بھی خوبصورت ہے۔ اگر جیب میں روپے نہ ہوں تو بمبئی بھی ایک قبرستان ہے۔

لدھیانہ پہنچ کر چار یا پانچ دن تک تو وہ ریل کے چار دن لمبے سفر اور ایک سالہ شب و روز مشقت کی تھکن اتارتا رہا۔ ابھی پندرہ سولہ دن باقی تھے۔ کیونکہ اس نے اپنے مالک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیس مارچ تک بمبئی واپس چلا جائیگا۔ وہ دن بھر اپنے پرانے یار دوستوں کے ساتھ چوڑا بازار، جیل روڈ، ویک فیلڈ گنج، سول لائنز، محلہ بوٹا جٹ اور جانے کہاں کہاں آوارہ گھومتا پھرتا۔ اور دوپہر ہی سے دوستوں سے پوچھنے

لگتا کہ آج ریکھی تھیئٹر میں کون سی فلم لگی ہے اور نولکھا تھیئٹر میں کونسی فلم — مگر بمبئی کی انگریزی فلموں کی طرح یہاں فلم جلدی جلدی نہیں بدلتے تھے۔ کئی کئی شاندار اور پربہار ہفتے چلنے والے فلم — ریکھی تھیئٹر میں فلم "رتن" کے بائیسویں پربہار ہفتے میں رحمان چار شو مسلسل دیکھ آیا۔ بمبئی میں بھی وہ یہ فلم دوبارہ دیکھ چکا تھا۔ نولکھا تھیئٹر میں "من کی جیت" لگی ہوئی تھی۔ مگر اس کے خیال کے مطابق وہ سائی پکچر بالکل بکواس تھی۔ پھر بھی اس نے دو بار مزید اس پکچر کو دیکھ کر ڈالا۔ شام کو بالعموم وہ نولکھا تھیئٹر کے قریب اقبال ہوٹل میں گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اس بے کام کی کاہل زندگی سے جلد ہی تھک گیا تھا۔ ویسے اس کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ دوست احباب اس کے گرد ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ بمبئی سے سیٹھ بنکر لوٹا تھا۔ چائے، پان، سینما، ناٹک کے علاوہ وہ مستقلاً قینچی سگریٹ بھی پینے لگا تھا۔ اس کا سخت گیر باپ جو رحمان کے بمبئی جانے سے پہلے اس سے ہمیشہ ناراض رہتا۔ اس پر ہمیشہ غصہ اتارتا تھا۔ اب اس پر بڑا مہربان ہو گیا تھا۔ شام کے وقت گھر کے آگے چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے ہوئے وہ اپنے دوستوں میں رحمان کی بڑی تعریفیں کرتا تھا۔ اور رات گئے تک رحمان کے انتظار میں گھر کا بڑا دروازہ کھلا رکھتا کہ — نوجوان لڑکا ہے۔ تھیئٹر وئیٹر دیکھتا ہے۔ دیر ہو ہی جاتی ہے — حالانکہ پہلے اسی نوجوان لڑکے پر دس بجے رات کے بعد دروازہ صبح تک کے لئے بند کر دیا جاتا اور صبح اس پر گالیاں اور جوتے برستے۔

گیارہ سو روپے — دراصل محبت اور روپے کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہر لڑکے کا سچا باپ یا ہر باپ کا کماؤ لڑکا بالعموم بہت زیادہ چہیتا ہوتا ہے۔

رحمان نے اپنے باپ یا ماں کی محبت پر کبھی شک نہیں کیا۔ ماں باپ کے بڑھاپے میں لڑکے کو کماؤ ہونا ہی چاہیئے۔ آخری وقت میں ان کی خدمت کرنی ہی چاہیئے۔ صرف گیارہ سو روپے کیا چیز ہیں گیارہ کروڑ، گیارہ ارب روپے بھی ماں باپ پر سے نچھاور کر دیئے جائیں تو بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر اس کے گیارہ سو روپوں نے ایک اور مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ماں کے لئے ایک آخری کام رہ گیا تھا — یعنی بہو کی تلاش — یعنی مرنے سے پہلے بیٹے کے سر سہرا دیکھنے کی بہت پرانی بہت ہی عام خواہش — جیسے ماں کی زندگی صرف بیٹے یا بیٹی کی شادی تک ہی محدود ہوتی ہو۔ جیسے اولاد کی شادی اس ملک میں ماں کی موت ہوتی ہو۔

چنانچہ رحمان کی ماں بھی مرنا چاہتی تھی۔ یعنی اپنے بیٹے کو دولہا بنا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ دن بھر بُڈھا ڈھے محلے کے گھر گھر لڑکیاں دیکھتی پھرتی رہی۔ اور گھر گھر میں رحمان کے گیارہ سو روپوں کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتی رہی۔ گویا شادی کے لئے لڑکے کی اولیں خصوصیت اس کی نوجوانی، اس کی شکل و صورت، اس کا جسم اور اس کا کردار نہیں بلکہ روپیہ ہے — لیکن

چوڑا بازار کے کئی گھروں میں رحمان خاں معہ گیارہ سو روپیہ بات چیت کا موضوع بن گیا۔ اور گھروں کی کنواریاں چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے رحمان خاں کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگیں۔ وہ کون ہے۔ وہ کیسا ہے۔ رحمان خاں خود ابھی شادی وادی کی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن بمبئی سے واپس آنے کے بعد اس کی ماں کی ماں کی مامتا میں بے حد شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور بمبئی میں وہاں کی شہوت انگیز تہذیب میں اس کی پانچسالہ ورزش کی بندش کئی بار ٹوٹ گئی تھی۔ ایک نیئے اور نشہ آگیں تجربے کے بعد عمر کا چوبیواں ورزنی سال سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ اس لئے اس نے سوچا کہ چلو جی — شادی کر ہی ڈالو۔ آخر کس پری کے انتظار میں کب تک سڑتا رہوں۔

ادھر نھانے دار خوشی محمدؐ کی لڑکی زینب سے اس کی بات پکی ہو گئی۔ اُدھر رحمان کو بیچ بیچ ایک پری نظر آگئی۔ وہ پری اسکے دوست محمد شفیع زنگر یز کی بہن تھی۔ اس دن حادثہ یہ ہوا تھا کہ رحمان محمد شفیع سے ملنے اسکے گھر گیا۔ جیسے ہی اس کے دروازے پر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک لڑکی، ایک بہت ہی سُرخ و سپید لڑکی دروازے میں کھڑی ایک بساطی سے دوپٹوں کی ململ خرید رہی ہے۔ رحمان کو دیکھ کر فوراً اس نے دروازہ بند کر لیا۔ رحمان اسکے اور ململ کے دوپٹے کے درمیان اس وقت حائل نہ ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے شفیع کو آواز دیئے بغیر آگے گزر گیا۔ مگر اسے ہر دم ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اب وہ خواہ مخواہ آگے جا رہا ہے۔ منزل تو پیچھے ہی چھوٹ گئی ہے . . . . .

بڑی دیر تک اد۔ کے ہوٹل میں بیٹھ کر وہ اس برقِ تجلّی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جو اس کے دل کے طُور پر ابھی ابھی گری تھی۔

قمیص
ہری شلوار
ہلکے پیلے رنگ کا دوپٹہ
لمبا گداز جسم۔
چمکیلی لالی اور رس رساتی سپیدی سے تراشا ہوا چہرہ

ایک لمحہ کیلئے چمکتا —— دروازے بند ہو جاتے —— جگمگاتا۔ پھر دروازے بند ہو جاتے۔ بڑی دیر تک رحمان یہی دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ رحمان کے دل میں اسے ایک بار اور دیکھنے —— نظر بھر کر، جی بھر کر دیکھنے کی شدید تمنّا پیدا ہوئی۔ یہ دیکھنا بھی بھلا کوئی دیکھنا ہوا۔ دیکھا بھی اور نہیں بھی دیکھا۔ یہ تو بجلی کا ایک کوندا تھا۔ یہ تو ایک قوس قزح تھی۔ یہ تو ٹوٹتے تارے کی منوّر لکیر تھی۔ جو یوں چمکی اور یوں چھپ گئی۔ رحمان نے ارادہ کر لیا کہ وہ بہر صورت کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کو ایک بار اور دیکھے گا۔ ضرور دیکھے گا۔ اچھی طرح دیکھے گا۔ اور جب تک نہیں دیکھے گا بمبئی بھی نہیں جائیگا۔

پھر وہ روز روز شفیع کے گھر جانے لگا۔ اس عرصے میں اسے لڑکی کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات بھی معلوم ہو گئیں۔ لڑکی کا نام معلوم ہو گیا تھا۔

"ریشماں"

جیسی وہ خود تھی۔ نام بھی ویسا ہی تھا۔ ریشماں، ریشمیں لڑکی نام معلوم ہونے کے بعد ریشماں اسے اور بھی اچھی معلوم ہونے لگی۔ اسے دیکھنے کی خواہش اور زیادہ بڑھ گئی۔ اس خواہش کی ہر لمحہ دل میں پرورش کرتے کرتے رحمان کبھی کبھی یہ محسوس کرنے لگا۔ جیسے اسی خواہش کے بطن سے ریشماں کے لئے اسکے دل میں گویا محبّت بھی پیدا ہو چکی ہے اور پھر اس پر طرفہ یہ کہ اس کا نام ریشماں تھا۔ لیکن فوری طور پر اسے دیکھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ٹھیٹ مسلمان لڑکی، کٹّر مسلمان گھرانے کی پردہ دار لڑکی۔

بیس مارچ بھی آ گئی۔ اسے بمبئی جانا تھا، مگر اس نے اپنے مالک کو ایک کارڈ لکھ دیا کہ —— دیگر احوال یہ ہے۔ کہ ابھی آٹھ روز بندہ بمبئی نہیں آ سکتا۔ یہاں پر کچھ خانگی کام لاحق ہو گئے ہیں۔ اگر آپ مجھے اور آٹھ دن کی چھٹی دے دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ فقط آپ کا تابعدار محمد رحمان خاں —— اور پھر آٹھ دن بھی گزر گئے لیکن رحمان کا انتظار اور اس کی ریاضت بیکار نہ گئی۔ نولکھا تھیٹر میں مسلمان عورتوں کے لئے کوئی عبرت انگیز درس آموز اصلاحی فلم لگی ہوئی تھی۔ دن کا شو تھا۔ شفیع اپنی ماں اور بہن کو تھیٹر تک پہنچانے جا رہا تھا کہ راستے میں رحمان مل گیا۔ رحمان کو دیکھ کر شفیع نے "خود" ہی کہہ دیا۔

"یار رحمان۔ کدھر جا رہا ہے۔ اگر تو دس منٹ یہیں میرا انتظار کر لے۔ تو میں ابھی واپس آتا ہوں"

رحمان نے کہا۔

"چل میں بھی وہاں تک ساتھ ہی چلتا ہوں۔ یہاں اکیلا کب تک کھڑا رہونگا"

نولکھا تھیٹر کے پاس عورتوں کی بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ عورتوں کی بھیڑ میں داخل ہو کر شفیع کی ماں اور ریشماں نے برقعوں کے نقاب الٹ ڈالے تھے۔ اور کچھ ایسا منظر تھا۔ جیسے سورج ڈوبا ہو۔ اور چاند طلوع ہوا ہے یا چاند ڈوبا ہے سورج طلوع ہوا ہے۔ ریشماں اس سے بالکل بے خبر تھی کہ کوئی کھڑا اسے گھور رہا ہے۔ اپنی نظروں میں بھرتا جا رہا ہے۔ معاً رحمان کو شفیع کا خیال آیا۔ اس نے فوراً جیب سے پیسے نکال کر کہا۔

"یار ذرا اس دکان سے ایک قینچی کا پاکٹ تو لے —— میں ذرا اُس لڑکی کو دیکھوں"

رحمان نے ایک دوسری ہی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ شفیع رحمان کا بڑا بے تکلف بڑا گہرا دوست تھا۔ اس لئے ہنستا ہوا قینچی کا پیکٹ لینے چلا گیا۔ رحمان گھورتا رہا۔

کالے کالے برقعے کے ہالے میں سُرخی مائل
سفید چمکیلا چہرہ بڑی بڑی کالی آنکھیں جن کے کناروں
میں سُرمے کی لکیریں تنی ہوئی تھیں۔ سپید چمک دار

سیبوں جیسے دیدے۔
کشمیری سیبوں جیسے گال۔
وہ گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ۔
ایسی لڑکی جس پر پہلی نظر پڑتے ہی دل میں فوراً اسے اغوا کرنے کا خیال پیدا ہو۔

اس کے بعد شفیع آگیا۔ اور رحمان کو مجبوراً لوٹنا پڑا۔ راستے بھر شفیع بہت سی باتیں کرتا رہا مگر رحمان نے کسی بات کا جواب نہیں دیا چپ چاپ چلتا رہا۔ اس کی اس چپ سے تنگ آکر شفیع نے اس سے پوچھا۔

"کیوں یار ——— کیا وہ لڑکی بہت پسند آگئی ہے کہ بس تو اپنے آپ ہی میں کھو گیا ہے۔ واہ یار —!"

رحمان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ رحمان کا جی چاہا کہ وہ اس سے صاف صاف کہدے کہ وہ لڑکی وہ نہیں ہے جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ بلکہ وہ لڑکی تو خود اس کی بہن ہے۔ مگر اپنی اس خواہش کو کسی اگلے مناسب وقت کے لئے ٹال کر رحمان نے اسے چائے پینے کی دعوت دے دی۔

رات بھر رحمان نولکھا تھیٹر کے احاطے میں کھڑا رہا۔ اور رات بھر رشیماں نقاب اُلٹے جلوہ ریز و جلوہ فگن کھڑی رہی۔ رحمان نے کہا۔ رشیماں فلم ختم ہوئے دیر ہو گئی۔ اب گھر جاؤ۔ رشیماں نے شرما کر مسکرا کر پوچھا ——— کیا تمہارا گھر اور میرا گھر الگ الگ ہے —؟ اوہ میں تو بھول ہی گئی ——— اچھا تو پھر تم مجھے میرے گھر پہنچا دو ——— رحمان دوڑا دوڑا تانگے لینے گیا۔ واپس آیا تو رشیماں نہیں تھی۔

.... رات بھر رشیماں اسکے ساتھ آنکھ مچولی سی کھیلتی رہی۔

دوسرے دن اس نے اپنی ماں سے کہدیا کہ وہ تھانے دار خوشی محمد کی لاڈلی زینب سے ہرگز شادی نہیں کریگا۔ ماں بڑی ناراض ہوئی کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔؟ بات چیت تو طے ہو گئی ہے۔ دونوں طرف کی بدنامی ہوگی یہ تو بڑی بری بات ہے بیٹا —— لیکن اب رحمان یہ سوچنے پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کونسی بات اچھی ہے اور کونسی بات بری ہے۔ اسے تو صرف رشیماں اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو مجبور کیا کہ وہ محمد شفیع رنگریز کے گھر جائے اور رشیماں کی ماں سے ملے۔ رشیماں سے ملے۔ رشیماں سے شادی کی بات کرے۔ رشیماں سے کسی طرح شادی کرادے۔ رشیماں۔ صرف رشیماں۔

ماں کچھ دیر سوچتی رہی۔ ماں پھر محمد شفیع رنگریز کے گھر گئی رحمان دوستوں کو گھر ہی پر سے ٹالتا رہا۔ ماں کی واپسی کا بڑی بےچینی سے انتظار کرتا رہا۔ ماں دو گھنٹے بعد ——— نہیں دو سال بعد واپس آئی۔ رحمان دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پوچھا۔

"بات پکی ہو گئی نا ماں —— تو کتنی اچھی ہے ماں۔ واہ وا"

مگر ماں نے کہا۔

"ارے کم بخت۔ مجھے برقعہ تو اتار لینے دے۔ بات کہاں پکی ہوتی ہے۔ اور کیسے ہو سکتی ہے!؟"

رحمان کا دل ڈوب گیا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور تیز تیز سانس میں پوچھا۔

"کیوں —؟"

ماں نے کہا۔

"اس کی تو اس کے چچیرے بھائی لطیف خاں سے منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اور اگلے سال ربیع الاول میں شادی بھی ہونے والی ہے۔"

رحمان کو غصہ آگیا اور وہ بولا۔

"نہیں ماں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کی منگنی کیسے ہو سکتی ہے۔! رشیماں سے صرف میں شادی کروں گا۔ میں لطیف خاں کو جان سے مار ڈالونگا"

ماں نے حیرت، خوف اور غصے سے ملی جلی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"کیا پاگل ہو گیا ہے تو —— کیسی باتیں کر رہا ہے!"

رحمان دھیما پڑ گیا اور اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر گڑگڑانے لگا۔

"ماں —— کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ریشماں سے میں شادی کرونگا۔ ورنہ میں مر جاؤنگا۔ کوئی ترکیب نکال میری اچھی ماں۔ مجھے زندہ اور خوش دیکھنا چاہتی ہے تو تجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ اچھا خیر —— میں خود ہی شفیع کے پاس جاتا ہوں"

رحمان نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور گھر سے نکل گیا۔ شفیع گھر پر ہی مل گیا۔ اس نے شفیع سے کہا کہ وہ اس سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ذرا اس کے ساتھ باہر تک چلے۔ پھر وہ اور شفیع اقبال ہوٹل گئے۔ رحمان نے شفیع کی خوب خاطر تواضع کی۔ کیک، پیسٹری، کریم رولس، سموسے، چائے، گولڈ فلیک ...... اور پھر بولا

"یار شفیع۔ ایسی بات ہے کہ میری زندگی کا سوال ہے تو میرا بچپن کا دوست ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ مگر میں نے ایک بات تجھ سے ہمیشہ چھپائے رکھی ہے۔ اور اب اسے بھی بتانے پر مجبور ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ تو کہیں ناراض نہ ہو جائے؟"

شفیع نے گولڈ فلیک کا ایک لمبا کش کھینچ کر اور گولڈ فلیک کے پھیکے پن کو ماں کی گالی دیکر بولا۔

"یار۔ زبان سے تو کچھ بول۔ ایسی کونسی بات ہوگی کہ میں تجھ سے ناراض ہو جاؤنگا"

رحمان نے کہا۔

نہیں پہلے تو خدا کی قسم کھا کہ تو ناراض نہیں ہوگا"

شفیع نے کہا ——

"یار قسم وسم کیا۔ پہلے کچھ بتا تو سہی"

رحمان نے اصرار کیا۔

"نہیں تو پہلے قسم کھا"

شفیع نے کہا۔

"اچھا بابا —— خدا کی قسم ناراض نہیں ہونگا۔

لے اب بول۔"

رحمان نے شفیع کو ایک بار وعدہ یاد دلانا چاہا۔

"دیکھ تو نے قسم کھائی ہے۔"

شفیع نے کہا:۔

"ہاں یار یاد ہے۔ جانے آج تجھے کیا ہوگیا ہے"

رحمان نے کہا۔

"یہی بات تو ہے یار کہ نہ جانے مجھے کیا ہوگیا ہے خیر اب تو نے قسم کھا کر وعدہ کیا ہے تو اب سن لے کہ میں ریشماں سے محبت کرتا ہوں۔ میں ریشماں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ریشماں کے بغیر ....."

شفیع نے غضبناک ہو کر کہا۔

"رحمان ——!!"

رحمان بولتے بولتے رُک گیا۔ ایک لمحے کے لئے شفیع کے سُرخ دھکتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور بولا۔

"تو ناراض ہوگیا نا آخر —— مجھے معلوم تھا کہ تو ناراض ہو جائیگا۔ مگر تو نے قسم کھائی تھی —— شفیع میرے بھائی مجھے معاف کر دے۔ میں بہت مجبور ہو گیا تھا۔ میں تیرا دوست ہوں۔ اسی لئے تیرے پاس بھیک مانگنے آیا تھا۔ محبت —— محبت کوئی بُری بات تو نہیں ہے شفیع۔!"

شفیع کا غصہ کچھ کم ہوگیا تھا۔ وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش پینے لگا تھا

"رحمان —— یہ صحیح ہے کہ تیری بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا تھا۔ مگر خیر تو بھی مجبور ہے۔ اور میں بھی مجبور ہوں۔ تجھے شائد نہیں معلوم کہ ریشماں کی منگنی ہو چکی ہے۔ میرے چچازاد بھائی لطیف خاں سے اگلے سال ربیع الاول میں اس کا عقد ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا"

رات بھر رحمان کے کان میں شفیع یہی کہتا رہا۔ کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ رحمان نے ارادہ کر لیا کہ وہ آخر وقت تک ہمت

نہیں ہارے گا۔ وہ بمبئی نہیں جاتے گا۔ یہیں ایک ٹیلرنگ فرم کھولے گا اور خوب کمائے گا۔ محبت سے نہیں تو کم از کم پیسے کے زور سے ضرور ریشماں کو جیت لیگا۔ آدمی ہمت کرے تو کیا نہیں ہوتا۔ ہمت ہو تو آدمی دنیا جیت لیتا ہے۔ ایک عورت کی بات ہی کیا ہے آخر.....

دو تین روز کی دوڑ دھوپ کے بعد ویک فیلڈ گنج میں رحمان نے کرائے پر ایک دوکان لے لی۔ اقساط پر دو سیونگ مشینیں خریدیں۔ سائن بورڈ آرٹسٹ پنچھی سے ایک بورڈ پینٹ کرالیا۔

ام رحمان خاں
بمبئی فیم ٹیلرا اینڈ اوٹ فٹر
ویک فیلڈ گنج لدھیانہ

چند ہی دنوں میں اس کا کام زوروں پہ چل نکلا۔ رحمان خاں شہر کے خوش پوش لوگوں اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت مشہور ہو گیا۔ نئی نئی وضع کے سوٹ، مردانی، زنانی شلواریں، مردانی زنانی قمیصیں۔ لیڈیز گرم کوٹ، جیٹر، بش شرٹ، فراکیں وغیرہ سینے میں سارے لدھیانے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اپنے کام میں بڑا محنتی، بڑا مشاق اور ایماندار آدمی تھا۔ وعدے کا بڑا پابند تھا۔ اسی لئے دن بدن اس کے دوکان میں گاہکوں کی بھیڑ بڑھتی گئی۔ گورمنٹ کالج کے سارے لڑکے اور لڑکیاں اُسی سے اپنے کپڑے سلوانے لگے۔ آمدنی بڑھنے لگی۔ اس نے تین ملازم اور رکھے۔ ہر گاہک سے بڑے اخلاق سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ کئی بڑے بڑے امیر گاہکوں تو اس کی جیسے دوستی ہو گئی تھی۔ اکثر لوگوں کا تو وہ ناپ بھی نہیں لیتا تھا۔ بہت سوں کے ناپ تو اسے ازبر یاد تھے۔ ایک جھلتی ہوئی نگاہ گاہک پر ڈالی اور اپنے جونیئر کو ناپ لکھوانے لگا۔ لکھو بھئی۔ سینہ ۳۴، کمر ۲۹، شولڈر ۳۵ کالر ۱۳......

رحمان کو ماہانہ تین چار سو روپے کی آمدنی ہونے لگی۔ دوسرے

درزی اور اس کے یار دوست اس کو بڑی رشک وحسد کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ دیکھنے میں درزی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اچھے اچھے سوٹ بوٹ پہنتا تھا۔ اتوار کو جب اس کی دوکان بند ہوتی وہ بہترین قیمتی سوٹ پہن کر ادھر اُدھر گھوما کرتا۔ سینما دیکھتا۔ اگر شفیع کہیں مل جاتا تو بس وہ اپنے بٹوے کا منہ کھول دیتا۔ ویسے اس نے شفیع پر دوبارہ کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ریشماں سے شادی کرنے کے ارادے پر ابھی تک قائم ہے۔ البتہ شفیع کی خاطر تواضع سے اس کا صاف مقصد یہی تھا۔ کہ اس کی کمائی اور ٹھاٹ باٹ کا شفیع کے گھر خوب چرچا ہو جائے ——— ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اس نے کسی نہ کسی طرح شفیع کی ماں اور خود ریشماں تک پہنچا ہی دی تھی۔ کہ وہ ریشماں کو نہ صرف چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات لطیف خاں کو بھی معلوم ہوئی تھی۔ اور خبری معلوم ہوئی تھی۔ لطیف خاں بیچارا میونسپل کارپوریشن میں ایک تھرڈ گریڈ کلرک تھا۔ پڑھا لکھا بابو ہونے کے باعث جسمانی اعتبار سے رحمان خاں سے کمزور تھا۔ اور لڑائی جھگڑے کو تہذیباً سخت ناپسند کرتا تھا۔ اسی لئے رحمان کو دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہتا۔ ویسے وہ رحمان کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ کیونکہ اس ملک میں منگنی توڑنا آسان کام نہیں ہے۔

ریشماں ——— ریشماں بھی کبھی کبھی رحمان کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ دو تین بار جب رحمان شفیع سے ملنے گھر آیا تھا تو ریشماں نے چوری چھپے دروازے کی درازیں سے جھانک کر دیکھا پہلی بار اس نے دیکھا تو وہ اسے اچھا معلوم ہوا۔ دوسری تیسری بار دیکھا۔ تو رحمان اسے پسند آگیا۔

ایک بار تو وہ رات گئے تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ بات یہ ہوئی تھی۔ کہ رمضان کی عید تھی۔ شفیع نے اپنے، اپنی ماں اور ریشماں کے کپڑے رحمان ہی کو سلنے دیئے تھے۔ ریشماں کے کپڑوں کے لئے شفیع نے حسب حیثیت پھولدار سوتی چھینٹ کا کپڑا خریدا تھا ——— مگر جب کپڑے سل کر آئے۔ تو ریشماں نے جب دیکھا کہ پھولدار سوتی چھینٹ نہیں ہے۔ بلکہ اودے چمکیلے رنگ کے ولایتی

ریشم کی قمیص اور شلوار سل کر آئی ہے۔ ریشماں نے واپس کرنا چاہا۔ تو رحمان نے کہلا بھیجا کہ میرے پاس سے وہ کپڑا کہیں کھو گیا ہے۔ یہ کپڑا میرے پاس فالتو رکھا تھا۔ اسی لئے اسی کے کپڑے سی دیئے ہیں۔ اس جواب سے شفیع چپ ہو گیا۔ اور رحمان نے دل ہی دل میں اس سے کہا۔

"احمق —— ریشماں کو ریشم ہی پہننا چاہیئے

ایسے ملائم جسم پر تو سوتی چھینٹ چبھتی رہتی ہے۔"

ریشماں اس رات دیر تک رحمان کے سوتی چھینٹ کھو دینے اور ریشمیں قمیص اور شلوار سی دینے پر، ایسی غلطی پر، ایسی بھول پر، حیران ہوتی رہی۔ سوچتی رہی۔ اور ایک دو بار جانے کیا سوچ کر کچھ شرما بھی گئی۔

اس واقعے کے بعد سے رحمان ریشماں سے کچھ کچھ قریب رہنے لگا۔ شفیع کا تو وہ دوست تھا ہی۔ شفیع کی ماں بھی کبھی کبھار کہہ دیتی کہ شفیع کے دوستوں میں اگر کوئی دوست ہے تو بس رحمان ہے۔ بڑا ہمدرد بڑا نیک ...... کبھی کبھی رحمان شفیع کے گھر دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد کھانا بھی وہیں کھا لیتا تھا۔ اب شفیع کی ماں دروازے کی اوٹ سے گھریلو معاملات پر اس سے صلاح مشورہ اور باتیں بھی کرنے لگی تھی۔

ایک دن شفیع ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ محلہ ٹوباجبٹ کے ایک گوجر لال دین سے کسی بات پر اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اور ایسا بڑھا کہ شفیع نے اس گوجر کو زیر مرمت سڑک کے پتھروں پر دے مارا جس سے اس گوجر کے سر میں، پیٹھ میں اور کہنیوں میں زخم آ گئے۔ پولیس نے ضرب شدید میں شفیع کا چالان کر دیا۔ اور حوالات میں بند کر دیا۔ شفیع کی ماں روتی چلاتی رحمان کے پاس گئی اور رحمان نے دو سو روپوں کی نقد ضمانت دینے کے علاوہ پولیس والوں کی مٹھی بھی گرم کی۔ اور شفیع کو چھڑا لایا۔

شفیع کی ماں نے رحمان کو دل کھول کر دعائیں دیں۔ شفیع نے خود اس کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھلانے کا وعدہ کیا اور ریشماں —— ریشماں اپنی آنکھوں پر پلکیں ڈھانپ کر رحمان کو بہت قریب، بہت نزدیک، سے دیکھتی رہی۔ اور قریب، بہت نزدیک ہو گئی۔

ایک دن جب شفیع گھر نہیں تھا۔ رحمان یہ جان کر بھی کہ شفیع گھر نہیں ہے۔ شفیع کے گھر گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس دن اتفاق سے شفیع کی ماں بھی کہیں اڑوس پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ گھر پہ سوائے ریشماں کے اور کوئی نہ تھا۔ رحمان کے دل میں بھی سوائے ریشماں کے اور کوئی نہ تھا۔

تھا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے رحمان نے ریشماں سے باتیں کیں۔ باتیں کرتے کرتے اسے پتہ چلا کہ ریشماں بھی اس سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔ ریشماں کو بھی اس میں کچھ دلچسپی ہے۔

پھر اس کے بعد رحمان کو ایسے ہی دو تین سنہری موقعے ملے۔ اور یہ معلوم کر کے اس کی خوشی بے اندازہ ہو گئی کہ ریشماں بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی ہمت اور اس کی ریاضت بالآخر پھل پھول لے ہی آئی۔ ریشماں بھی تو ایک پھل تھی —— میٹھا میٹھا پھل۔ ریشماں ریشماں بھی تو ایک پھول تھی۔ رنگین اور مہکتا پھول —— !

اب اس پھول کے پاس صرف ایک ہی کانٹا رہ گیا تھا —— لطیف خاں —— لطیف خاں خیر کچھ اتنا طاقتور نہیں تھا۔ کہ رحمان اسے اپنے راستے سے ہٹا نہ سکے۔ منگنی البتہ بڑی مضبوط دیوار تھی۔ جو ریشماں لطیف خاں اور رحمان کے درمیان حائل تھی۔ اور منگنی توڑنا اس ملک میں آسان کوئی آسان کام نہیں ہے۔

رحمان سوچ سوچ کر تھک گیا کہ اس منگنی کو آخر کس طرح توڑے —— اُسے صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا —— اغوا —— اور ریشماں تھی بھی کچھ ایسی لڑکی کہ اسے دیکھ کر پہلے پہل اغوا ہی کا خیال دل میں پیدا ہو —— لیکن اغوا کس طرح کیا جائے۔ شاید ریشماں خود اسے پسند نہ کرے۔ پہلے ریشماں کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔ وہ ممکن ہے۔ شاید وہ تیار بھی ہو جائے —— !!

کئی دن تک رحمان موقعہ ڈھونڈتا رہا کہ ریشماں سے تنہائی میں ملے ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ ریشماں کی ماں کو کسی کام سے اپنے گھر بلا لے۔ ریشماں کی ماں رحمان کے گھر چلی گئی۔ شفیع اپنی دوکان پر تھا —— رحمان ریشماں کے پاس گیا۔ ابھی ریشماں سے اس نے باتیں شروع بھی نہ کی تھیں کہ لطیف خاں اندر آ گیا۔ اس نے پہلے تو ریشماں کو گھور کے دیکھا اور پھر رحمان کو ——

رحمان لطیف کے اس طرح غیر متوقع اچانک آجانے پر بہت سٹپٹا گیا تھا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ لطیف ایک پاگل آدمی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ رحمان چاہتا تو لطیف کو بُری طرح پیٹ سکتا تھا۔ مگر لطیف نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھرا نکالا اور رحمان کے شانے میں گھونپ دیا۔ رحمان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ریشماں بڑی پریشان ہوگئی اس نے اپنی ہمسائیوں کو آوازیں دیں۔ پڑوس کے گھر سے چند آدمی آگئے۔ پھر پولیس آگئی۔ شفیع بھی آگیا۔ پولیس نے لطیف کو گرفتار کر لیا اور رحمان کو "براؤن ہسپتال" پہنچا دیا گیا۔ رحمان کو کوئی ایسا کاری زخم نہیں لگا تھا۔ وہ خطرے سے باہر تھا۔ البتہ لطیف کو چھ ماہ کیلئے جیل میں بند کر دیا گیا۔

رحمان تین مہینے ہسپتال میں رہ کر باہر نکلا تو سیدھے ریشماں کے گھر گیا۔ شفیع رحمان سے سخت ناراض تھا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد سے ریشماں سارے شہر میں بدنام ہوگئی تھی۔ شفیع نے رحمان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

رحمان بڑا بدحواس ہوگیا۔ اتنی محنت سے بنا بنایا کام یوں بگڑ گیا۔ لطیف کی قید کے بعد آخری کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ مگر رحمان فطرتاً دُھن کا پکا تھا۔ ہمت نہیں ہارا۔ پھر ایک داؤں لگایا۔ اس نے شہر کے بڑے بزرگوں کو ہموار کیا اور ان کے ذریعے شفیع کو کہلوانا شروع کیا کہ اب ضد بیکار ہے۔ ریشماں جس کے لئے بدنام ہوئی ہے اسی سے اس کی شادی کرنا پڑے گی۔ کوئی دوسرا آدمی رحمان کی موجودگی میں اس سے شادی کرنا کبھی گوارا نہ کریگا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ ریشماں رحمان کے ساتھ خراب ہو چکی ہے۔ آخر کب تک بٹھائے رکھے گا اسے ——؟

رحمان کا یہ داؤں کارگر ثابت ہوا۔ ایک دن شفیع خود ہی رحمان کے گھر آیا۔ اور بڑے روکھے پھیکے کاروباری سے لہجے میں بولا کہ۔

شادی کی تاریخ مقرر کر دو

رحمان خوشی سے جیسے دیوانہ ہوگیا۔ اسے جیسے اپنے آپ پر پیار آگیا۔ اور وہ پنکج ملک کی طرز میں گانے لگا۔

آج اپنی محنتوں کا مجھ کو ثمرہ مل گیا......

شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ ۱۷؍اگست ۴۷ء دونوں گھروں میں بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رحمان بڑے فخر کے ساتھ لوگوں سے کہتا —— یارو۔ شادی تو یہ ہے ورنہ لوگ تو یوں شادی کرتے ہیں جیسے گھر سے نکلے۔ ہیرا منڈی چلے گئے عورت یا بیوی حاصل کرنا تو بہت معمولی بات ہے۔ بات چیت ہوئی سودا طے ہوا۔ نکاح ہوا۔ چلو جی شادی ہوگئی۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ۔ یہ بھی کوئی بیاہ ہوا بھلا۔ شادی کا اصلی مزا تو یہ ہے کہ تکلیفیں اٹھا کر مصیبتیں جھیل کر جان جوکھم میں ڈال کر عورت حاصل کرو۔ تب شادی کا مزا آتا ہے۔ میری شادی تو ایسی شادی ہے۔ کہ کوئی فلم کمپنی چاہے اس کا فلم بنا ڈالے —— لکھو یار بمبئی ٹاکیز کو ایک خط لکھ ڈالو —— ہاہاہا۔

اب شادی میں صرف سات روز باقی رہ گئے تھے لیکن رحمان نے اپنے ماں باپ اور شفیع کی والدہ اور شفیع سے کہا کہ یہ سات روز بھی بہت زیادہ ہیں۔ شادی کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک ہوجانی چاہیئے۔ کیونکہ لدھیانے میں ہندو مسلم فساد کا بڑا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی ہیں کہ کلکتے سے بمبئی تک اور لاہور سے جالندھر تک فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناک آگ بھڑک اٹھی ہے لدھیانے کے چاروں طرف سے آگ بڑھتی ہی چلی آرہی ہے —— لدھیانہ بھی بچ نہ سکے گا۔ جانے کب کوئی چنگاری گرے اور لدھیانہ بھی بھڑک اٹھے —— شفیع کا خیال تھا کہ نہیں لدھیانے میں سب کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں ہندو سکھ اور مسلمان برسوں سے بھائی بھائی کی طرح رہتے آئے ہیں۔ یہاں جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

شادی میں دو روز باقی تھے۔ اچانک سارے شہر میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ کہ چوک نیم والا میں ایک سکھ نے ایک مسلمان کے چھرا

گھونپ دیا۔ چنگاری گری اور الاؤ صیانہ آن کی آن میں بھڑک اٹھا ——

چوڑا بازار کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ریشماں چوڑا بازار ہی میں رہتی تھی۔ اب چوڑا بازار ویک فیلڈ گنج سے بہت دور ہو گیا تھا۔ پھٹتے ہوئے بموں، سنسناتی ہوئی گولیوں جلتے مکانوں کے دھوئیں میں کچھ بھی نہ دکھائی دیتا۔ زمین پر آدمیوں کا خون کیچڑ بن گیا تھا۔ اور لوگ بھاگ رہے تھے۔ لوگ لڑ رہے تھے۔ لوگ گر رہے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ چوڑا بازار اور ویک فیلڈ گنج کے درمیان لاشیں گور و کفن سے بے نیاز سڑ رہی تھیں

رحمان اپنے باپ اور ماں کے منع کرنے رونے چلانے کے باوجود گھر سے نکلا چھپتا چھپاتا، نظریں بچاتا ریشماں کے گھر کی طرف چلا —— ریشماں کے گھر کا بڑا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ رحمان جب اندر داخل ہونے لگا۔ تو ٹھٹک کر رک گیا۔ دہلیز پر ریشماں کا سبز رنگ کا ململین دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ اور ریشماں نہیں تھی۔ رحمان دروازے ہی سے چیخنے لگا۔

ریشم!

ریشماں!!

سناٹا گہرا سناٹا —— صحن میں شفیع کی لاش دو ٹکڑے ہو کر پڑی تھی۔ اور اندر کمرے میں ایک بوڑھی عورت، سو رہی تھی یا بیہوش پڑی تھی یا مر گئی تھی۔

رحمان غضبناک ہو کر باہر دوڑا ——

ریشم —— !

ریشماں —— !!

وہ دوڑنے لگا۔ جیسے کوئی اسی راستے پر ریشماں کو اٹھا لے گیا ہو۔ جیسے اس نے ابھی ہمت نہ ہاری ہو۔ جیسے اب بھی ریشماں کو ڈھونڈ نکالنے اور اسے پا لینے کی اسے پوری امید ہو۔ جیسے وہ کبھی اغوا ہو ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ خود اس کا خیال تھا کہ ریشماں ایسی لڑکی ہے۔ جس کو دیکھ کر پہلے اغوا ہی کا خیال دل میں آتا ہے۔

وہ دوڑ رہا تھا۔ فضول بے مقصد دوڑ رہا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ سب کچھ ہو جانے کے بعد پھر کیا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں نے سب کچھ چھین لیا تھا۔ سب کچھ تقسیم کر ڈالا تھا۔ صرف ملک ہی نہیں بلکہ غریبوں اور بے گناہوں کے جسم تقسیم کر ڈالے تھے۔ دل تقسیم کر ڈالے تھے۔ معصوم محبتیں تقسیم کر دی تھیں عصمتیں تقسیم کر دی تھیں۔

رحمان دوڑتے دوڑتے دل ہی دل میں جانے کس سے پوچھ رہا تھا کہ ریشماں کا قصور کیا تھا —— ؟ کس کا قصور کیا تھا۔ قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک غریب رنگریز کی بہن تھی۔ وہ ایک درزی تھا۔ قصور یہ تھا کہ وہ غریب تھے۔ جاہل تھے۔ بیوقوف تھے —— اور کوئی قصور نہیں ....

دوڑتے دوڑتے جیل روڈ کے چوراہے پر دفعتاً وہ چیخ مار کر اوندھے منہ گر پڑا۔ اور ہزارا سنگھ ایک قہقہہ لگا کر اپنی لہو میں ڈوبی ہوئی کرپان کو ریشماں کے دوپٹے سے صاف کرتا ہوا دوسرے شکار پر جھپٹا۔

بڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو اسے ریشماں نظر آئی اس نے آنکھیں جھپکا کر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ تو ریشماں نہیں تھی —— نرس تھی۔ اور وہ براؤن ہسپتال کے ایک بیڈ پر پڑا تھا۔ رحمان چیخا۔

"ریشم —— ریشماں۔ ریشماں کہاں ہے۔

ریشماں !!"

رحمان کی چیخیں سن کر وارڈ کی دوسری نرسیں اس کے بیڈ کے پاس آ گئیں۔ ایک اینگلو انڈین نرس نے اسے ڈانٹا۔

"اے۔ یو۔ تم کیوں چلاتا ہے۔

چپکا لیٹا رہا ہو۔"

ایک ہندوستانی نرس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اینگلو انڈین نرس کو مخاطب کر کے کہا۔

"اس کی عورت کو کوئی "اغوا" کر کے لے گیا ہے —— بیچارا !!"

اسی اثنا میں ایک اور نرس تازہ اخبار لئے وارڈ میں داخل ہوئی

سب نرسیں اس کے گرد جمع ہو کر اخبار دیکھنے لگیں۔ جس کے پہلے صفحے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، قائدِ اعظم محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویریں چھپی تھیں۔

رحمان برابر چیخے جا رہا تھا۔

"ریشماں —— ریشماں کو کون لے گیا۔ بتاؤ۔
میں اسے جان سے مار دونگا"

اینگلو انڈین نرس کو بہت غصہ آیا۔ اور وہ اخبار لیکر اس کی طرف بڑھی۔

"اے بو — —— تم بہت تنگ کرتا مانگتا
چپ کرو۔ لائی ڈاؤن۔ گوٹو سلیپ"

رحمان پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے نرس سے پوچھا۔

"میم صاحب —— میری ریشماں کو کون لیگیا
بتاؤ —— میں اسے مار ڈالوں گا"

اینگلو انڈین نرس کو ایک شرارت سوجھی اور اس نے بڑے مسخرے پن سے اخبار اس کی طرف بڑھایا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔

"یہ آدمی تمہارا عورت کو لے گیا۔ سمجھ گیا تم!"

اور وہ زور سے ہنس پڑی۔ رحمان نے غصے سے نرس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا۔ تصویر کو غور سے دیکھا۔ اور پھر اخبار کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ جیسے سچ مچ اپنے آخری رقیب کو بھی اپنے اور ریشماں کے راستے سے ہٹا دیا ہو۔

اخبار لانے والی نرس غصے سے چیخی۔

"اے کیا کرتا ہے تم —— پاگل ہوگیا ہے!؟"

دوسری نرسیں زور زور سے ہنسنے لگیں۔

رحمان پھر بستر پر گر گیا۔ جیسے اب اس نے بدلہ لیا ہو۔ جیسے اب اس میں مطلق ہمت نہ رہی ہو۔ جیسے وہ پہلی بار ہارا ہو۔ اس نے درد اور دکھ کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں

اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہار گیا

———

اے حمید

شروع شروع میں

لاہور پہنچ کر جس پہلے مکان میں ہم نے بسیرا کیا وہ دو منزلہ تھا۔ یہ پرانا اور حویلی نما مکان باہر سے خاصا بڑا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اندر چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھڑیوں کی وجہ سے تنگ اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ اس کا مالک ایک ہندو تاجر تھا جو منڈی میں تیلوں اور سینگ کا دھندا کرتا تھا۔ اور جو ہندوستان جا چکا تھا۔ جب ہمارا کنبہ چچا اور چچی کے ساتھ یہاں آیا تو یہ بالکل ویران پڑا تھا اور اس کی خالی کوٹھڑیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں چھتیں نیچے کو جھک آئی تھیں۔ کونوں کھدروں میں مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے۔ کوٹھڑیوں میں ٹوٹے پھوٹے خالی ٹرنک اوندھے پڑے تھے۔ آنگن میں اِدھر اُدھر میلے کچیلے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اندر برسات کے مارے اس قدر سیلن ہو رہی تھی اور سینگ کی تیز بو تھی۔ کہ خواہ مخواہ جی بُرا ہو رہا تھا۔ چچا اپنی خشخشی داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکلا اور دیدے گھما کر بولا۔

'غنڈے تو ہر ایک شے کا صفایا کر گئے! حرامزادوں نے چولہوں تک کو ڈھا دیا۔ اب ہمارے لئے یہاں کیا دھرا ہے؟'

وہ دھوتی سنبھالتا ہوا دوسری کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اندر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی آواز سنائی دی۔ آواز میں مدھم سی گونج تھی۔ جیسے کسی اندھیرے کنوئیں سے بول رہا ہو۔

'ارے اندر تو کنواں بھی ہے'

ہم لوگ جلدی سے اندر آ گئے۔ آرٹسٹ بھائی سب سے پہلے پہنچا کوٹھڑی میں بالکل اندھیرا تھا۔ بیکا ٹیڑھا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ چھت کے قریب ایک بوسیدہ روشندان میں سے دن کی روشنی کا پھیکا سا غبار اندر پھیل رہا تھا۔ چچا ایک جگہ جھکا نیچے جھانک رہا تھا۔

'میں نے تو گرتے گرتے بچا۔ اس کنوئیں میں ضرور مال متاع ہوگا'

وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔

'اس میں ضرور کچھ نہ کچھ سائنس ہو گی۔ گھر والے گھبراہٹ میں سب کچھ یہیں پھینک گئے ہوں گے۔ کیا نام۔ میرا خیال ہے مجھے نیچے اترنا چاہیئے'

چچی غصّے میں بولی۔

'تیرا دماغ تو چل گیا ہے؟ سانپ سنپولوں کی بہار ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو؟ میں تو اس کوٹھڑی کو تالا لگا دوں گی'

چچا نے کاغذ کا ایک چیتھڑا دیا سلائی سے جلا کر اندر پھینکا۔ کنوئیں کے اندھیرے غار میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ اور دور نیچے پانی کی ساکن سطح کے گدلے آئینے میں ایک جلتا ہوا چیتھڑا جیسے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ کاغذ بجھ گیا اور غار میں پھر تاریکی چھا گئی۔ چچا نے باہر نکلتے وقت آرٹسٹ بھائی کے کان میں کہا۔

'تم چپکے ہو رہو۔ اس کنوئیں کی ضرور خبر لیں گے۔ کیا پتہ اس میں کیا سائنس ہو؟'

چچا اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک مدت سے لاہور میں رہ رہا تھا اُس نے بڑی بیٹی کی شادی بھی لاہور میں ہی کی تھی۔ اس مکان میں گھس آنے سے پہلے چچا کا کنبہ شہر سے باہر، دریا کے کنارے والی آبادی میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایک تو دور بہت تھی۔ اور پھر مکان کا کرایہ بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ جس وقت ہم امرتسر سے ہجرت کر کے چچا کے ہاں پہنچے۔ تو اُس نے فوراً اس مکان پر قبضہ جما لیا شہر کے کسی اور علاقے میں جا کر مکان ڈھونڈنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہاں ابھی تک مار دھاڑ ہو رہی تھی۔ اور کہیں کہیں آگ بھی لگ جاتی تھی۔ مکان کی پہلی منزل کی دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پیدا ہو رہی تھیں۔

اور کنوئیں والی کوٹھڑی میں رات کو سانپ کے بولنے کی آواز آیا کرتی تھی سیلن اس قدر تھی کہ گزرتے وقت کپڑوں کو چھوتی محسوس ہوتی تھی۔ ہم نے رہن سہن کے لئے دوسری منزل کا انتخاب کیا۔

یہاں آمنے سامنے دو کوٹھڑیوں کے بیچ میں ایک آنگن تھا۔ جس کی داہنی طرف کھرے میں پمپ لگا تھا۔ چچا سائیکلوں کی مرمت کا دھندا کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے سب سے پہلے پمپ کی ہتھی کو اور نلکی کے پرزوں کو تیل سے اچھی طرح تر کیا۔ اور پھر پمپ چلانے لگا۔

'سالی ہتھی تو بالکل جام ہوگئی ہے'

اُس کی گول مٹول گڑیا سی بیٹی زینی نے جلدی سے پانی کی بالٹی آگے کر دی چچا بالٹی کو ٹانگ سے پرے کرتے ہوئے بولا۔

'دیکھتی نہیں تیل والا پانی نکل رہا ہے؟'

نیچے سے اوپر آنے والی سیڑھیوں کی چھوٹی سی ڈیوڑھی کا رُخ ہماری کوٹھڑیوں کی طرف تھا۔ ان دونوں کوٹھڑیوں میں سے ایک پٹ نچلی تنگ گلی میں کھلتا تھا اور دوسری میں روشندان تک نہ تھا۔ وہاں دن بھر گھپ اندھیرا چھایا رہتا اور اندر چوہوں کے کھیل تماشے جاری رہتے۔ گلی والی کوٹھڑی گرچہ ریل کے سب سے چھوٹے ڈبے کی مانند تھی۔ تاہم کھڑکی ہونے کے باعث وہاں روشنی اور ہوا کا کافی آرام تھا۔ اسکے پٹ محلے والے اکھاڑ لے گئے تھے۔ یہ سدا کھلی کھڑکی بھی جنت کا دروازہ ہی تھی۔ ہوا کے جھونکے فر فر اندر آیا کرتے سامنے ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جس کے تین طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں اور ایک طرف بڑا سا محرابی دروازہ —— یہ احاطہ بھی بالکل سُونا سُونا پڑا تھا اور صحن میں کتے بلیاں گشت لگایا کرتی تھیں۔ ذرا پرے چھوٹا سا میدان تھا جس میں آہنی سلاخوں والے پرانے جنگلے کے گھیرے میں ریلوے مزدوروں کے اِک منزلہ کوارٹروں کی آمنے سامنے دو قطاریں تھیں۔ کوارٹروں کی چھتوں پر چارپائیاں آڑے ترچھے کھڑی رہتیں اور آنگنوں پر جھکے ہوئے چھجے لکڑیوں کے گٹھوں سے لدے رہتے۔ بارش کے وقت ان پر جلدی جلدی ترپالیں اور بوریئے پھیلا دیئے جاتے۔ دروازوں پر ٹاٹ لٹکتے رہتے۔ اور درمیانی گلی میں مزدوروں کے ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے گالی گلوچ میں لگے رہتے جب شام ہو جاتی تو ان کوارٹروں میں سے پتھر کے کچے کوئلوں کا کڑوا دھواں نکل نکل کر ارد گرد فضا میں پھیلنے لگتا اور ہر شے پر اداسی اور بے چارگی کا لبادہ

سا ڈال دیتا۔ جہاں کوارٹر ختم ہوتے تھے۔ وہاں ذرا ہٹ کر کنک پھرے ٹین کی چار دیواری کھڑی کر کے ٹٹیاں بنائی ہوئی تھیں۔ جس کے باہر بڑے بڑے بجّل پڑے رہتے اور گندگی پر مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔

کوارٹروں کے عقب میں بڑی سڑک تھی۔ جو دریا کی طرف ساگوان کے ذخیروں میں نکل گئی تھی۔ سڑک کے پار ریلوے سٹیشن کا یارڈ تھا۔ جہاں چمکتی ہوئی پٹڑیوں کا جال سا بچھا تھا۔ ان پٹڑیوں پر کالے کالے مٹیالے انجن چھک چھک چھک چھک کا شور مچاتے اُبھرے ہوئے مرغوں کی طرح آٹھوں پہر شنٹ کرتے رہتے تھے۔ رات کے سمے ان انجنوں کی دُموں پر جلتی ہوئی سرخ بتیاں بڑی بھلی لگتیں۔ دور سٹیشن کی قلعہ نما عمارت پر پاکستانی جھنڈا ہوا میں پھڑ پھڑایا کرتا۔ جب رات کافی بھیگ جاتی اور ہر طرف گہرا سناٹا چھا جاتا تو کانٹا بدلنے والوں کی لمبی آوازیں خاموش فضا میں دیر تک گونجتی رہتیں۔ ایک جگہ کے کھڑے انجن راکھ اگلتے ہوئے سسکارتے رہتے۔ اور کبھی کبھی کھٹاک سے کانٹا بدلنے کی آواز سنائی دے جاتی۔ سٹیشن پر ہری ہری بتیاں جلتی رہتیں اور سگنلوں کے سُرخ سبز قمقمے تاریکی میں جگ مگ کرتے رہتے۔

امرتسر خالی ہونے پر جالندھر، انبالہ، لدھیانہ اور فیروز پور سے پناہ گزینوں کا تانتا سا بندھ گیا اور لوگ دھڑا دھڑ شہر کے خالی مکانوں میں گھسنے لگے۔ ہمارے مکان کی نچلی منزل ابھی تک خالی تھی۔ لیکن ایک روز جو ہم سو کر اٹھے تو نیچے سے کسی عورت کی بے سُری آواز آ رہی تھی۔

'خالی ٹرنک باہر مت پھینکو۔ چیتھڑے ایک طرف جمع کر لو۔

ذرا مجھے جھاڑو پکڑانا —— اری چھیما تو کہیں ٹکے گی بھی'؟

چچا دھوتی باندھتے ہوئے لپک کر نیچے اُتر گیا۔ جب پل بھر بعد ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر نمودار ہوا۔ تو اُس کے بھدے ہونٹوں پر بڑی مکار ہنسی تھی۔

'گورداسپور کا کوئی کوچوان ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ کرایہ ہمارے ہی سپرد کرنا ہوگا'

گوری رنگت اور ناٹے قد کے اس کوچوان کی آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا۔ اور اُسکے خاکی رنگ کے میلے کچیلے کپڑوں سے بید اور

گھوڑوں کے پسینے کی بُو آیا کرتی تھی۔ ماتھے اور ہاتھوں کی سبز رگیں پھول گئی تھیں۔ وہ ہروقت غصے میں رہتا تھا اور بولتے وقت اُسکے ہونٹوں کے کونے جھاگ سے بھر جاتے اور صورت سے وحشت برسنے لگتی۔ وہ عموماً رات گئے گھر آتا اور گلی میں کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو آوازیں دینے لگتا۔ اُس کی بیوی جس کے سر کے اُلجھے ہوئے خشک بالوں میں جیسے چڑیوں نے اپنے گھر بنا رکھے تھے۔ بوسیدہ پلنگڑی کے جھول سے ہم ہما کر اُٹھتے ہوئے کہتی۔

'آئی جے ——'

اُس کی بے سُر اور کرخت آواز میرے کانوں پر پتھر کی طرح پڑتی۔ اور وہ دیر تک سنسناتے رہتے۔ وہ جلدی سے، ننگے پاؤں، ننگے سر نیند میں لڑکھڑاتی نیچے اُتر جاتی اور اُس کی بیٹی چھیما پلنگڑی خالی پا کر اُٹھ بیٹھتی۔ اور بلند آواز میں رونا شروع کر دیتی۔ اس دُبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کا سارا جسم سُرخ سُرخ پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ناک سدا بہتی رہتی تھی۔ روٹی وغیرہ نچلی منزل کے گھمس میں ہی کھانے کے بعد کوچوان اپنی بیوی کے آگے آگے حقہ ہاتھ میں لئے دروازے پر نمودار ہوتا اور سوتے جاگتے چچا کو سلام کر کے اپنے کوٹھے کی طرف چل دیتا۔ یہ کوٹھا ساتھ ہی تھا۔ درمیان میں صرف چھوٹی سی دو گز اونچی دیوار حائل تھی۔ اُس کا حقہ دیر تک گڑگڑاتا رہتا۔ وہ اپنی بیوی سے دھیمے دھیمے باتیں بھی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی اُس کا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ آواز ایک دم اونچی ہو کر ڈوب سی جاتی۔ پھر اُس کی بیوی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگتیں۔ یا حقہ الٹنے یا گلاس کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز آتی۔ اور پھر پہلے ایسی خاموشی چھا جاتی۔

ایسے لمحات میں چچا چچی سے اتنا کہہ کر کروٹ بدل لیتا۔

'یہ آئے دن کا ناٹک بھی خوب رہا،'

کوچوان کی بیوی کو کھانے کا مرض تھا۔ وہ دن بھر کچھ نہ کچھ چرتی رہتی اور پاخانے میں دیر تک بیٹھی رہتی تھی۔ کسی وقت تندور کی روٹیوں سے بھری ہوئی چنگیر لیکر ماں کے پاس بیٹھ جاتی اور آہ بھر کر کہتی۔

'مجھے تو یہاں کا پانی بالکل راس نہیں آیا۔ گورداسپور کا پانی تو جھٹ کھانا ہضم کر ڈالتا تھا۔ اور بی بی یہاں تو بھوک ہی نہیں لگتی،'

اُسے زبان کے چٹخارے کی بھی بڑی لت تھی۔ املی، اچار کھٹی امبیاں کچے آلوچے، تیز اچور اُسکے من بھاتے کھاجے تھے۔ اور ماں کا کہنا تھا۔ کہ وہ چھپ چھپ کر کچا گوشت کھایا کرتی ہے۔ اتنا سننے کے بعد میں اُس سے ڈرنے لگا تھا۔ ایک روز اُس کا خاوند بڑے چاؤ سے گائے کا خاص قسم کا گوشت لایا۔ ساتھ ساتھ پاؤ بھر چربی بھی تھی۔ بی صاحبہ نے کیا کیا کہ گوشت کو تو ہاتھ نہ لگایا مگر چربی تمام کی تمام چٹ کر گئیں۔ اور شام کو بھید کھل گیا۔ کوچوان نے اُس کی خوب مرمت کی۔ جب وہ غصے میں ہانپتا کانپتا باہر نکل گیا تو اُس نے کنوئیں والی کوٹھڑی میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کنوئیں کے گرد چکر لگانے لگی اور بکری کی طرح ممیا ممیا کر کہنے لگی۔

'میں تو چھلانگ لگا لونگی۔ میں ڈوب مروں گی۔ مجھے کوئی نہ روکے بس اب میرا کھانا پینا اُٹھ گیا'

ماں اور چچی کو بڑی فکر دامنگیر ہوئی۔ مگر چچا نے ناک سکیڑ کر کہا۔ 'اس میں بھی کوئی نہ کوئی سائنس ہوگی،'

دوسرے ہی لمحے کوٹھڑی کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور کوچوان کی بیوی اندر سے نکل کر پلنگڑی پر اوندھی لیٹ گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں راشن لینے کے لئے باہر جانے لگا۔ تو وہ زمین پر بیٹھی دال والی ہانڈی آگے رکھے روٹی کھا رہی تھی۔ قریب ہی اُس کی بچی گندگی میں لتھڑی رو رہی تھی۔ اُس کے بال بڑے چھوٹے تھے۔ جب کبھی وہ انہیں گوندھتی تو پھولی ہوئی چھوٹی سی چوٹی اُس کی گردن پر مُرغی کی دُم کی طرح اُٹھی رہتی اور مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی۔

ہمارے پاس چارپائیاں صرف چار تھیں۔ ایک پر چچا اور اُس کا بیٹا، دوسری پر چچی اور زینی —— تیسری پر جو ذرا بڑی تھی ماں، باجی رضیہ اور چھوٹی رو گی بہن اور چوتھی پر دادا جان سوتے تھے۔ میں ابا جان اور آرٹسٹ بھائی درمیانی منزل میں گلی والی سدا کھلی کھڑکی کے پاس زمین پر سوتے تھے۔ کھڑکی میں سے خوب ہوا اور محلے کی بدبو اندر آیا کرتی۔ کسی روز ہوا بند ہوتی تو مچھر رات بھر نہ سونے دیتے۔ آرٹسٹ بھائی پنکھا ہاتھ میں لئے بیٹھا رہتا اور مچھر مارتا رہتا۔ ابا جان نیلی سی دھوتی تانے بہت جلد خراٹے لینے لگتے اور میں کھڑکی کی چوکھٹ سے سر لگائے سوگ بھری آنکھوں سے سٹیشن کی ہری ہری لال لال روشنیوں کا تماشہ کرتا رہتا۔

آرٹسٹ بھائی کو یہاں سب سے زیادہ تکلیف یہ تھی کہ سیر سپاٹے کے لئے لمبے لمبے کھیتوں کی کھلی فضا، پھلدار درختوں سے مالا مال ٹھنڈی

چھاؤں والے باغ اور سبز سبز کناروں والی نہریں نہ تھیں۔ کنوئیں کا پانی بھی نیم گرم اور کسیلا تھا اور مسجدوں کے غسل خانے بھی بے حد گندے تھے اور گلیوں میں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ پھر بھی وہ عادت سے مجبور، پو پھٹے ہی اٹھ بیٹھتا اور چپ چاپ باہر گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ دن چڑھے واپس آتا۔ تو اُسکے چہرے پر تھکن اور پژمردگی کے آثار نمایاں ہوتے جیسے جنموں کا سفر دنوں میں طے کرکے آ رہا ہو۔ پمپ کے نیچے بیٹھ کر وہ کھارے پانی سے نہاتا۔ امرتسر میں وہ حمام سوپ استعمال کرتا تھا۔ لیکن یہاں نہانے اور کپڑے دھونے کا صابن ایک ہی تھا — دیسی صابن — جس کا تیز سوڈا بدن کو چھیلے ڈالتا تھا۔

نمکین اور تیلی چائے کا ایک پیالہ پی کر وہ سارا دن کام کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور شام کو تھک ہار کر پسینے میں شرابور گھر لوٹ آتا۔ اخیر اساڑھ کی تیز دھوپ میں اُس کا رنگ کالا ہو گیا تھا اور خوراک ایکدم گھٹ جانے کے باعث چہرہ پیلا پڑنے لگا تھا، رات کو، کھجوری پنکھا ہاتھ میں لئے وہ بُجھا بُجھا سا زمین پر بیٹھ جاتا اور کھڑکی میں سے باہر سگنلوں کی سُرخ سُرخ سبز سبز بتیوں کو گھورتے ہوئے کسی وقت دھیمی آواز میں کہتا

"اس شہر میں میرا دم گھُٹتا ہے۔ ہائے! وہ کمپنی باغ کے ٹھنڈی چھاؤں والے درخت، وہ ٹھنڈے کنوئیں کا سرد و شیریں پانی اور شریف پورہ کے عقب میں ناشپاتیوں، آلوچوں کے گنجان باغ اور چھاؤنی سینما کو جانیوالی یوکلپٹس اور املتاس کے درختوں میں گھری ہوئی پتلی سی سڑک — کاش ہم امرتسر نہ چھوڑتے۔ کیا پتہ اب کبھی یہ باغات دیکھنے نصیب نہ ہونگے ہم کبھی اُن درختوں کی چھاؤں میں نہ بیٹھ سکیں، کبھی اُن کنوؤں کا پانی نہ پی سکیں"

اُس کے لہجے میں ایکاایکی غم اور درد جھلکنے لگتا اور افسردہ آنکھوں میں پرانے دنوں کی سہانی یادیں اُمڈ آتیں۔ پنکھا جلتے ہوئے اس کا ہاتھ آپ ہی آپ رُک جاتا، جیسے وہ خیال ہی خیال میں شریف پورہ کے پچھواڑے ناشپاتی، آلوچہ اور امرودوں کے باغوں میں گھوم رہا ہو۔ چھاؤنی کی طرف جانیوالی یوکلپٹس اور املتاس کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر نکل گیا ہو اور کمپنی باغ کی سایہ دار روشوں پر سے گزرتا ہوا گہرے نیلے آسمان تلے تختوں میں کھلے ہوئے رنگ برنگ پھولوں اور گھاس پتیوں کا سنہرا خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس وقت اُس پر ایک ایسے بوٹے کا گمان ہوتا، جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے مرجھا یا گیا ہو۔

رات کو بارش ہونے لگتی۔ تو دونوں کنبے دوسری منزل میں گھس آتے اور وہاں اصطبل ایسا ماحول پیدا ہو جاتا۔ کھلی کھڑکی میں سے سٹیشن کی روشنیاں بارش کی نیلی اور گیلی چادر کے عقب میں دھندلا جاتیں۔ اور ہوا کے جھونکے مینہ کی پھواروں کو اٹھا اٹھا کر میرے اوپر پھینک جاتے۔

رات بھر کھیتوں میں جھینگر اور پپیہے بولتے رہتے اور زمین پر سونے والوں کی ٹانگوں پر چیونٹیاں اور تلچٹے رینگتے رہتے، احاطے میں پرسائیوں تلے بندھے ہوئے گدھے ڈھیچوں ڈھیچوں کرنے لگتے اور محلے کی گندی نالیوں میں سے اُٹھتی ہوئی بدبو گھر بھر میں پھیل جاتی۔ کہیں نہ کہیں سے چھت زور ٹپکنے لگتی۔ اُس وقت چچا دھوتی باندھے ہوئے اٹھتا اور اندھیرے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر کسی نہ کسی چارپائی یا صندوق سے ٹکراتا، کوئی نہ کوئی برتن ڈھونڈ نکالتا۔ اور اُسے عین ٹپکنے والی جگہ کے نیچے فرش پر رکھ دیتا۔

پانی کی بوندیں۔ ٹن ٹنک ... ٹن ٹنک ... ٹن ٹنک ...

کی راگنی الاپتیں برتن میں گرتی رہتیں۔ اور باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں بارش کا شور تیز ہو جاتا۔ علی الصبح آنکھ کھلتی تو کیچڑ سے بھری ہوئی گلیوں میں لوگ شڑاپ شڑاپ قدم اٹھائے چل رہے ہوتے۔ سٹیشن کی قلعہ نما عمارت بارش میں دھل کر نکھر گئی ہوتی۔ کواڑوں والے گھنے درخت کی شاخوں میں چڑیوں کی چہکاریں گونج رہی ہوتیں۔ ریل کی پٹڑیاں مینہ میں نہانے کے بعد چمکنے لگتیں۔ انجنوں سے نکلتی ہوئی دودھیا بھاپ کے مرغولے زیادہ شفاف دکھائی دیتے اور نرمل فضا میں، کانٹا بدلنے والوں کی لمبی آوازیں بہت جلد ہم تک پہنچ جاتیں۔ آرٹسٹ بھائی کا چہرہ ان جانی مسرت سے چمک اٹھتا اور وہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ جیسے فضا کی ساری رطوبت اور تازگی پی ڈالنا چاہتا ہو۔

ابا جان سارا دن دوکان کی تلاش میں گھومتے رہتے اور بھائی کام کی تلاش میں اجنبی شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہتا۔ دوگی بہن گھپ اندھیرے والی پچھلی کوٹھڑی میں زمین پر لیٹی رہتی۔ اور ویران آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہتی۔ شاید وہ دن رات روتی رہتی۔ اگر اس کے اندر رونے کی قوت ہوتی۔ لاہور آنے کے بعد وہ بالکل سوکھی ساکھی مُردہ

چھ بیاسی بنکر رہ گئی تھی۔ دادا جان کھڑکی کے پاس آلتی پالتی مارے مزے سے بیٹھے رہتے اور کسی وقت موج میں آجاتے تو ایک آدھ تان ہی اُڑا دیتے۔

'کیوں تن مانجھتا ہے جوگی ......'

دادا جان کی آواز اگرچہ کمزور تھی۔ مگر اُس میں بے حد گداز اور رس تھا۔ گھر میں اپنے پلّے سے راشن منگوانے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ محلے کی لیگ کمیٹی مفت راشن دیتی تھی۔ میں وہاں سے شروع شروع میں راشن لاتا رہا۔ دو دن کا آٹا، دال، ہلدی، نمک، مرچ اور کسی روز چاول بھی مل جاتے اور ہانڈی میں ڈالنے کے لئے تیل بھی —— ایک تو وہاں مجھ ایسے چھوٹے بچوں کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ گھنٹوں بھیڑ میں کھڑے رہنا پڑتا۔ پھر راشن دینے والے لوگ ہمیں اس طرح گھورا کرتے۔ گویا ہم ذلیل بھکاری ہوں اور اُن کے در پر آن گرے ہوں۔ دوسرے ہفتے ہی اُنہوں نے کہہ دیا۔

'لڑکے اب راشن نہیں ملیگا۔ اپنے بھائی سے کہو کوئی کام کرے۔ یہاں اب چندہ ختم ہوگیا ہے'

اُن کا چندہ ختم ہوگیا اور گھر میں آٹے کا کنستر کھڑکھڑانے لگا۔ اور پہلی بار ہی دو روز کا فاقہ آگیا۔ چچا کی حالت پناہ گزینوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ اپنی سائیکلوں کی دوکان پر سے شام کو یوں مضمحل لوٹتا۔ جیسے اپنا سب کچھ گنوا کر آرہا ہو۔ وہ ہر رات ابا جان کے پاس اپنا دکھڑا لیکر بیٹھ جاتا۔

'کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کام کا بے حد مندا ہے ایک بھی سائیکل پنکچر نہیں ہوتا۔ دوکان کا کرایہ مفت میں پڑ رہا ہے۔ کیا نام —— کاروبار میں تو ایسی بریک لگی ہے کہ دماغ چکرا گیا ہے'

اور میرا جی چاہتا کہ ابا جان اُسے کہیں۔

'اس میں بھی کوئی نہ کوئی سائنس ہوگی'

اُسے خواہ مخواہ آٹھوں پہر رونے کی علت تھی۔ حالانکہ اُس کی بیٹی زینی ہر وقت بنی ٹھنی رہتی۔ اُسکے سر پر ہر دوسرے تیسرے روز چنا ہوا نیا دوپٹہ ہوتا اور اُس کا بیٹا ماں سے لڑ جھگڑ کر سینما دیکھنے کے لئے روپیہ ڈیڑھ روپیہ مار ہی لے جاتا تھا اور چچی کو تو رات کے سمے چھپ چھپ کر دودھ پیتے اور گلاس میں انگلی ڈال کر اُس کی ملائی کھاتے میں نے دو ایک مرتبہ دیکھ بھی لیا تھا۔ کسی روز اُس کی بڑی لڑکی سسرال سے آتی۔ تو رخصتی کے وقت

چچا اُسے ٹوکری بھر کر پھل خرید دیتا۔ اور تھوڑا بہت نقد بھی دے دیتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کنبے پر ہر وقت آٹے نون کا ذکر مسلط رہتا۔ دوپہر کو کھا پی کر یوں بات بات پر آہیں بھرنے لگتے۔ گویا شام کے کھانے کے لئے کچھ بھی نہ بچا ہو۔ جس روز چچا ریلیف کیمپوں کی طرف سے ہوکر واپس آتا۔ تو گھر بھر میں خوف و ہراس پھیلا دیتا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

'لوگ دھڑا دھڑ بھاگتے چلے آرہے ہیں۔ سنا ہے ہندوستان کی فوجیں واگے پر جمع ہو رہی ہیں۔ میں کل ہی مشعال خان کو پشاور خط لکھتا ہوں۔ یہاں سے بھاگتے ہی بنے گی'

چچی سہم کر کہتی۔

'مگر وہاں بھی تو لوگ آجائیں گے'

اور چچا جھلا کر کہتا۔

'تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ ہم پشاور میں تھوڑے ہی رہیں گے۔ ہم تو آزاد علاقے میں جا بسیں گے۔ تمہیں کیا معلوم بچپن میں میں کہاں کہاں گھوما کیا ہوں۔ بس اب بقیہ زندگی تو آزاد علاقے میں ہی بسر ہوگی۔'

ماں کا چہرہ ایک دم اتر جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں کمزور اور بیمار سائے منڈلانے لگتے۔ وہ خشک اور بے جان آواز میں آرٹسٹ بھائی سے پوچھتی۔

'چلو ہم بھی کسی طرف نکل چلیں'

اور آرٹسٹ بھائی بڑے یقین سے کہتا۔

'یہ بکواس ہے ماں۔ ہم کہیں اور نہ جائیں گے۔ اب یہی ہمارا وطن ہے۔ اس کی خاطر ہم نے گھر بار لٹوایا ہے، بہن بھائیوں، بیوی بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور نہ جائیں گے۔ بلکہ اگر ضرورت پڑی تو اپنا رہا سہا خون بھی اس پر نچھاور کر دیں گے'

ماں کا حوصلہ بندھ جاتا۔ وہ اپنا بوڑھا سر جھکا لیتی۔ امرتسر سے آنے کے بعد اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور سر کے بال سفید ہونے لگے تھے وہ مریضوں کی طرح نقاہت سے اِدھر اُدھر چلا پھرا کرتی۔ اور باتیں کرتے وقت اُس کی آواز کئی بار بیٹھ جاتی اور نچلا ہونٹ اپنے آپ پھڑکنے لگتا۔

ابا جان کا چہرہ جھریوں سے اور زیادہ مرجھا گیا تھا۔ اور وہ باقاعدہ نماز پڑھنے لگے تھے۔ باجی رضیہ کے دوپٹے اور شلواریں بھی دو ایک پیوند آ لگے تھے۔ اور آرٹسٹ بھائی کی زندگی جیسے سر سے لیکر پاؤں تک بجھ سی گئی تھی، جیسے اسکے پھر سے جل اٹھنے کا گمان کوئی نہ ہو۔ وہ ہر ایک سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا اور پہلے سے زیادہ ضدی بن گیا تھا۔ اب اُسے شہر میں کام ملنے لگا تھا۔ اور وہ کوئی نہ کوئی بورڈ لاکر صحن میں ایک طرف چپ چاپ کام میں مگن رہتا۔

بیرنگ دن بڑی اکتا دینے والی یک رنگی اور اداسی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ماموں علی کے آ جانے سے گھر میں چہل پہل سی نظر آنے لگی۔ ماموں علی امرتسر میں بھی اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ وہ ابا جان کا پرانا یار باش تھا اُسے قصے کہانیاں سنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ خود اگرچہ ان پڑھ تھا۔ مگر پنجابی زبان میں بڑے لمبے لمبے شعر سنایا کرتا تھا۔ اور کہانی بیان کرتے ہوئے درمیان میں کسی نہ کسی جگہ اپنے شعر بڑی چابک دستی سے جڑ دیتا تھا۔ گھر کی چوکھٹ میں نمودار ہوتے ہی اس نے اپنی سیاہ رنگ کی پرانی کھال کی ٹوپی جس کے پھونسڑے نکل آئے تھے سر سے اتار کر ہنستے ہوئے ابا جان اور دادا جان سے سلام دعا لی اور حقہ لیکر دری پر بیٹھ گیا۔

اُسی شام قصہ خوانی کی محفل گرم ہوئی۔

دبلا پتلا سیاہ جسم، منڈی ہوئی ٹانڈ، پیازی آنکھیں، مونگ پھلی کے دانوں ایسے زرد زرد دانت، پاٹ دار آواز، ماموں علی نے حقے کا کش لیکر دھواں چھوڑا اور مونچھوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"قصہ بنانے والا، اللہ کا نام لیکر اس داستان کا یوں آغاز کرتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ملک چین میں ایک شہزادی رہتی تھی......"

ماموں علی کی تقریباً ہر کہانی اس طرح شروع ہوتی اور کئی کئی دن جاری رہتی۔ کہانی کہتے کہتے درمیان میں وہ کسی وقت رُک جاتا۔ اور یوں ایک طرف گھورنے لگتا۔ جیسے دور کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہا ہو۔ میں فوراً تاڑ جاتا کہ وہ کہانی کا باقی حصہ گھڑ رہا ہے۔ کسی وقت وہ جوڑ توڑ میں ناکام رہتا۔ تو بڑی آسانی سے اپنا ایک آدھ شعر جڑ دیتا

"تو زناب، اس موقع پر اس عاجز بندے نے بھی ایک خیال باندھا ہے کہ

ـــ

اسی دوران میں اُسے کچھ نہ کچھ سوجھ جاتا۔ اور وہ جلدی سے کہانی کا سلسلہ جوڑ دیتا۔

"اس وقت کے قصے اور اس وقت کی باتیں، شمی طوطی کیا کہتا ہے۔ بادشاہ سلامت سے کہ اے بھولے بادشاہ! حکم دیا جائے کہ میرے لئے ایک من گھی میں چوری کوٹ کر لائی جائے اور پھولوں سے لدی ہوئی سیج تیار کی جائے۔ پھر جب میں ساری چوری چٹ کر جاؤں اور غنودگی کے عالم میں نرم نرم سیج پر لوٹنے لگوں۔ جب وہ راز تم پر ظاہر کر دوں گا جس پر تیری بادشاہت کا دارومدار ہے......"

وہ اس قدر انہماک سے کہانی سنانے میں مگن ہوتا جیسے اپنی آپ بیتی بیان کر رہا ہو۔ اسکے منہ سے تھوک اڑ اڑ کر ہم پر گرا کرتی۔ مگر ہم کو احساس تک نہ ہوتا۔ اس کی کہانیاں ہم پر جادو کر دیا کرتی تھیں۔ شام کو جب وہ چلنے لگتا۔ تو ماں اُسے کھانے کی دعوت دے دیتی۔ جسے ماموں علی فوراً قبول کر لیتا کھانا کھاتے دیکھ کر اُس پر خواہ مخواہ رحم آنے لگتا۔ اگر رات زیادہ ہو جاتی۔ یا کبھی برسات کی جھڑی لگ جاتی۔ تو ماموں علی وہیں پڑ رہتا۔

اُس کی اُٹھتے بیٹھتے، ہائے، ہائے کرنے کی عادت مجھے دل سے بری لگتی۔ جیسے کسی نے اُس کی کمر توڑ دی ہو۔ یا اُسکے جوڑوں میں درد ہو۔ حالانکہ وہ ٹٹو ایسا تھا۔ یہ اُس کی پرانی عادت تھی۔ امرتسر میں بھی وہ ہمارے ہاں جب کبھی آتا۔ تو اس کی ہائے ہائے کی پکار سیڑھیوں میں ہی گونجنے لگتی تھی۔

سامنے احاطے کی کوٹھڑیاں دیکھتے دیکھتے آباد ہو گئیں۔ صحن میں اینٹیں جوڑ کر چولہے بن گئے اور میلے کچیلے کپڑوں والی بدنما عورتیں ادھر ادھر چکر کاٹ کرتے یا جھاڑ و پھیرتے دکھائی دینے لگیں تیسرے پہر جب دھوپ ڈھل جاتی۔ لمبی چھتوں پر بھدے ڈیل ڈول والے کسان بیٹھ جاتے۔ درمیان چنگیر میں چوڑی چوڑی روٹیاں اور پیاز رکھ دیئے جاتے اور یہ لوگ جبڑے ہلا ہلا کر کھانے لگتے۔ اور ہر لقمے کے بعد پانی کا گھونٹ پیتے جاتے۔ پتہ چلا یہ لوگ ضلع گورداسپور کے کسان ہیں جو اپنی زمینیں، پیاز کی کھیتیاں گندم کے کھیت، دودھ دینے والی بھینسیں، جوان بیٹیاں اور معصوم

بہنیں وہیں چھوڑ آئے ہیں ——— دن چڑھے جب میں کھڑکی سے سر
نکال کر چھتوں پر انہیں سویا ہوا دیکھتا۔ تو مجھے اُن پر بے حد ترس آتا دل
اُن کی کسی نہ کسی طرح مدد کرنے کو بےتاب ہو جاتا۔ وہ پردیسی لوگ چارپائیوں
بوسیدہ بوریوں پر کھلے آسمان تلے نیم عریاں پڑے ہوتے۔ صبح کی پھیکی
روشنی میں اُن کے زرد چہرے اور بے رنگ دکھائی دیتے۔

چولہوں میں پہلے پہر ہی آگ جل اٹھتی اور بڑی بڑی روٹیاں تیار ہو
جاتیں۔ کبھی پیاز اور کبھی گڑ اور کبھی محض پانی کے ساتھ روٹی کھا پی کر یہ بیچارے
دفتروں اور ریلیف کیمپوں کی خاک چھاننے نکل جاتے اور عورتیں گھر میں
دن بھر لڑتی جھگڑتی رہتیں یا اپنے بچھڑے ہوئے بیٹوں، بہنوں، بیٹیوں
کو یاد کر کے آہیں بھرتی رہتیں۔

احاطے کے شمالی مشرقی حصّے میں، پشت کی جانب ایک جہازی مکان
کھڑا تھا۔ اس کا مالک کوئی مسلمان ٹھیکیدار تھا۔ مکان کی کھڑکیوں پر رنگین
اور ریشمی پردے جھولتے رہتے اور اندر سے ریڈیو کی تانیں باہر آیا کرتیں
کسی وقت کھڑکی میں ایک مردہ سی عورت کا زرد چہرہ اداس نگاہوں سے
گلی میں پل بھر کیلئے جھانک کر پیچھے ہٹ جاتا۔ شام پڑنے پر دو لڑکیاں کوٹھے
کی لمبی چھت پر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں ٹہلا کرتیں۔ جیسے وہ جاپانی
گڑیاں ہوں۔ اور اُن میں کسی نے کوک بھر دی ہو۔

گلی میں دن بھر شور مچا رہتا۔ دن ڈوبتے ہی جب دھوپ پھیکی پڑ جاتی
تو لوگ اپنی چارپائیاں اندر سے گھسیٹ کر دوکانوں کے آگے ڈال دیتے۔
حقے لیکر، تاش کھیلتے، فحش مذاق کرنے اور مہاجرین کی پھیلائی ہوئی گندگی پر
زور شور سے گفتگو شروع ہو جاتی۔ مکانوں کی کھڑکیاں کھول دی جاتیں اور
گھروں سے دھوئیں کے نرم نرم مرغولے اُٹھنے لگتے۔ بڑے بازار میں قہوہ
خانوں کے سامنے چھڑکاؤ ہوتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ ریڈیو شروع ہو
جاتے اور قہوہ اور تمباکو پیتے ہوئے لوگوں کے درمیان باتوں کا ایک سلسلہ
چھڑ جاتا۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ اور ریلیف
کیمپوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ گلی گلی مہاجرین کے لئے حکومت کمیٹیاں
جمع کر رہی تھی۔

ایک رات میں چچا کے ساتھ ٹھیکیدار والے مکان میں خبریں سننے چلا گیا
پیچ در پیچ زینوں اور لمبے لمبے برآمدوں اور سنسان آنگنوں سے
گزر کر ہم ایک لمبے چوڑے کمرے میں پہنچے۔ یہ کمرہ اگرچہ سادگی سے سجا ہوا
تھا۔ مگر بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ دیواروں پر جڑی ہوئی بڑی بڑی
تصویروں کے شیشے اور فریم گرد سے اٹے ہوئے تھے دروازے
پر گرا ہوا پردہ دھیرے دھیرے جھول رہا تھا۔ چھت کے عین بیچ
میں سبز بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی کمرے کی ہر چیز پر کائی کی طرح جم رہی
تھی۔ ایک طرف بڑے بڑے گدّوں والے صوفے پڑے تھے درمیان
میں گہرے سُرخ رنگ کا قالین بچھا تھا۔ پلنگ پر ایک آدمی بیٹھا اپنی
گود میں کالی بلی بٹھائے اُسے پیار کر رہا تھا۔ بلی زرد زرد چمکیلی آنکھوں
سے ہمیں گھورنے لگی۔ تپائی پر ریڈیو مدھم سروں میں بول رہا تھا۔ ہمیں
اندر آتے دیکھ کر اُس آدمی کی پھولی ہوئی پکوڑا سی ناک سکڑ گئی۔ اُس نے
بھویں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے خالی کرسیوں
کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے وہاں کی ہر شے سے ڈر معلوم ہونے لگا
چچا بڑے ٹھسے سے کرسی پر ڈٹ گیا۔ فضا میں کسی تیز اور عجیب قسم کی بو
والے عطر کی لہریں تیر رہی تھیں۔ مجھے اپنے گھر کی کنوئیں والی کوٹھڑی کا
خیال آگیا اور اُس آدمی کو دیکھ کر شریف پورے والا نیم دیوانہ بیوپاری
یاد آگیا۔ ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ میرے دل پر اداسی اور خوف
کے ہلکے ہلکے بادل چھائے رہے۔ خبریں سننے کے بعد ہم لوگ واپس اپنی
اندھیری کوٹھڑیوں اور غلیظ آنگنوں والے مکان میں آگئے۔ جہاں دن
کو چوہے دوڑا کرتے تھے۔ اور رات کو سانپ کی آواز آیا کرتی تھی۔

چچا کو کسی نہ کسی طرح پتہ لگا کہ ساتھ والے خالی مکان میں ابھی کچھ
مال باقی ہے۔ پھر کیا تھا۔ ایک رات اُس نے آرٹسٹ بھائی کو ساتھ لیا
اور اوپر سے مکان میں کود گیا۔ اُس مکان کی چھت پر بڑا سا 'گمٹ' تھا جس کی
سلاخیں ٹوٹ کر ایک طرف کو مڑ گئی تھیں۔ میں اپنے کوٹھے کی منڈیر پہ سے
لگا، اس گمٹ میں سے نیچے جھانکنے لگا۔ رات تاریک تھی اور مٹیالے ستارے
جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ گمٹ کے نیچے کسی نے دیا سلائی جلائی۔ اور پھر
لیمپ کی روشنی پھیل گئی۔ اب نیچے سے چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے کی آوازیں
آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد آرٹسٹ بھائی ایک کنستر، پیتل کا مٹکا اور
پلنگ کی نوار کا پورا چکر اٹھائے اوپر نمودار ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس
نے تمام چیزیں مجھے پکڑا دیں۔ اور بلی کی چال پھر نیچے اتر گیا۔ میرے دل

میں بھی نیچے جاکر تماشہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں دبے دبے زینہ طے کرکے اُس خالی مکان کی درمیانی منزل میں آگیا۔ وہاں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ زمین پر ٹوٹے پھوٹے کنستر، ٹرنک، لوٹے، اور ٹین کے ڈبے اُلٹے سیدھے پڑے تھے۔ کہیں ہلدی الٹ گئی تھی تو کہیں دالیں بکھری ہوئی تھیں۔ گندے چیتھڑوں کا انبار لگا تھا۔ آرٹسٹ بڑے صندوق پر لیمپ لئے کھڑا تھا۔ اور چچا چھتی میں گھسا دنیا جہان کا کباڑخانہ جمع کررہا تھا۔ ایک ڈبے کا ڈھکنا کھول کر اُس نے چٹکی بھر سفید سی شے منہ میں ڈال کر اور جلدی سے تھوک کر ڈبہ آرٹسٹ کو تھما دیا۔

"سالے ہر ڈبے میں نمک بھر گئے ہیں"

پھر وہ ایک پوٹلی میں سے سونف نکال کر چبانے لگا۔ وہ چالاک گلہری کی طرح ہر شے کو منہ میں ڈال کر اُسے چکھتا اور پھر نگل جاتا۔ یا تھوک دیتا۔ کوٹھڑی میں گندے چیتھڑوں کی بو میں میرا دم گھٹا جارہا تھا مجھے محسوس ہوتا کہ گلے سڑے پانی سے لبریز جوہڑ کے کنارے کھڑے ہیں۔ یا کسی کباڑیئے کی پچھلی کوٹھڑی میں گھس آئے ہیں۔ میرے قریب ہی دیوار پہ کوئلے سے بینگے ٹیڑھے حروف میں لکھا تھا۔ "پاکستان مردہ باد"، "ہندوستان زندہ باد"، "بلاد یوی آج سسرال گئیں"۔

چچا ایک ٹانگ پر چھتی اور دوسری ٹانگ صندوق پر ٹکا کر نیچے اُترا تو گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اُس نے بغل میں سے ایک پرانا سیاہ رنگ کا کوٹ جھاڑ کر اُسی وقت پہن لیا۔ اور اُسے اِدھر اُدھر سے کھینچتے ہوئے گھوم کر بولا۔

"نمبر ون کوٹ ہے۔ میرا کوٹ تو بالکل پھٹ چلا تھا"

یہ سیاہ کوٹ پہنے، سر پر کالی ٹوپی رکھے، بڑھی ہوئی داڑھی اور پھولے ہوئے نتھنوں کے ساتھ، وہ واقعی کالا چور دکھائی دے رہا تھا میں اوپر چڑھنے لگا۔ تو چچا نے پرانے چیتھڑوں کا ایک گٹھڑ میرے سر پر رکھ دیا اور سیڑھیوں پر میرے قدم کئی بار لڑکھڑا گئے۔

دوسرے دن، رات کو چچا لالٹین اور دیا سلائی لیکر پھر اُسی مکان میں گھس گیا۔

(زیر تصنیف ناول "ڈریے" کا ایک باب)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

شیخ ناصر علی

یوں تو افتخار علی کی آمد اور صبح کے وقت شیخ صاحب کی خاموشی اب کچھ اس حد تک متعلق تھیں کہ ایک کے معلوم ہونے پر دوسری کے متعلق یقین سے پیشنگوئی کی جاسکتی تھی، لیکن جب دن چڑھے تک نہ شیخ صاحب کی آواز سنائی دی نہ گلی محلے میں ان کا دبدبہ رہا۔ تو لوگوں کی حیرانی شک و شبہ میں تبدیل ہوگئی۔ پہلے پہل جب ایک آدھ بار شیخ صاحب کے وظیفے کی آواز صبح کے وقت سنائی نہ دی۔ تو لوگوں کو خیال گزرا شاید شیخ صاحب کی طبیعت نصیب دشمناں ناساز ہوگی۔ مگر اب یہ بات ان پر کھل چکی تھی۔ کہ واقعہ یوں نہ تھا۔ بلکہ اس دن ان کا لڑکا افتخار علی آیا تھا، ——— خدانخواستہ یہ بات نہیں تھی۔ کہ افتخار کو شیخ ناصر علی کے وظیفوں سے بیر تھا۔ یا ان کی صبح خیزی کی عادت پر اعتراض تھا، صبح خیزی! اس نے کبھی اعتراض کیا بھی تو محض اس لئے کہ اس سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑنے کا احتمال تھا، کئی بار ان سے یہ عرض کی اور بڑے ادب سے کہ قبلہ! آپ اتنی صبح نہ اُٹھا کریں، نصیب دشمناں اگر سردی لگ جائے، یا پھر اگر اس نے کبھی ان سے کچھ کہا تو اس طرح کہ آپ صبح ٹھنڈے پانی سے وضو نہ کیا کریں۔ بلکہ نوکر کا تھوڑا انتظار کر لیا کریں۔ کہ وہ آگ جلا کر پانی گرم کر سکے۔

نماز، روزے اور دوسری مذہبی باتوں کا تو وہ خود بھی بہت دلدادہ تھا، اچھا خاصا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ بہت سادگی پسند تھا، ابھی تک کوٹ پتلون تک استعمال نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ شلوار اور اچکن ہی پہنتا تھا ——— ہوسٹل کے ساتھی گواہ تھے۔ کہ اس نے کبھی نماز قضا بھی نہ ہونے دی تھی، ہوسٹل میں اس کا توتا محاورہ بن چکا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مولوی صاحب کا گھوڑا یا پنڈت جی کی بھلی۔ اور کالج کے اکثر ساتھی اسے مولوی افتخار علی کہا کرتے تھے

خود شیخ صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف تھا بلکہ بڑا فخر تھا کہ ان کا بیٹا اتنا سادہ، نیک اور فرمانبردار ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کی محفل میں حقے کے کش لگاتے ہوئے اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کبھی گلی محلے میں کسی لڑکے بارے کی شکایت ان تک پہنچتی یا لوگ کسی کو ان کے پاس نصیحت کے لئے لے آتے۔ کیونکہ وہ محلے کے سربرآوردہ اور بارسوخ آدمیوں میں سے تھے تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے افتخار کی مثال دیا کرتے تھے۔

"بیٹا اپنے بھائی افتخار کو دیکھو، اسکے متعلق کبھی ایسی شکایت سننے میں آئی، وہ بھی آخر تمہاری عمر کا ہے، یہیں پلا ہے ——" اور ان کے ساتھی اگر شکایت ان کے اپنے لڑکے کی نہ ہوتی کہتے ———

"ہاں شیخ صاحب ماں باپ ہی پہ جاتی ہے اولاد، وہ آخر آپ کا بیٹا ہے، آپ نے تربیت دی ہے اسے"، اور شیخ صاحب کا سر فخر سے بلند ہو جاتا اور وہ مسرور دل سے کہتے "اللہ اسے سلامت رکھے"۔

شیخ صاحب کا خاندان کچھ عجیب تھا، ایک طرف تو مذہبی تعلیم بہت ضروری تھی، لڑکے اگر مسجد جا سکتے تو وہاں جاتے ورنہ ان کے لئے تو مولوی صاحب قرآن حدیث پڑھانے کے لئے گھر آتے اور لڑکیوں کیلئے الگ بیویاں مقرر تھیں، یہ حال تو بچوں کا تھا اور دوسری طرف جوانوں کا یہ حال کہ کہیں بٹیروں کی لڑائیاں ہیں تو کہیں مرغوں کی جنگ اور کہیں پتنگوں کے پیچ، یہ تو شیخ صاحب کی آنکھوں دیکھی باتیں تھیں۔ مگر جو کانوں سنی باتیں تھیں وہ ان سے بھی کہیں بڑھ کر تھیں، شیخ صاحب نے ان خاندانی روایات کو یکسر توڑ دیا تھا، پڑھ لکھ کر دفتر میں ملازمت کی بزرگوں نے احتجاج کیا، بڑی بوڑھیوں نے ناک چڑھائے کہ اس نے خاندان کو بٹہ لگایا، لاج گنوائی، کبھی کسی نے خاندان میں نوکری نہ کی تھی۔ مگر

شیخ صاحب اپنے ارادے کے پکے تھے اُنہوں نے اپنی من مانی کی، نوکری کی اور اپنے ڈھنگ پر کی، ایسی جگہ کی جہاں سے لوگوں نے جھولیاں بھر بھر کر دولت سمیٹی تھی، دونوں ہاتھوں سے گھر بھرے تھے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے گویا قسم کھا رکھی تھی۔ کہ تنخواہ کے علاوہ کسی سے ایک پیسہ لینا بھی حرام ہوگا، یہی نہیں اپنے آدمیوں کے کام تک سے اجتناب کیا کہ اسے سفارش اور رشوت سمجھا جائے گا —— کسی نے کہا بھی اُنہوں نے جواب دیا،

"کر دوں گا کیا، ایک بیوی ہے، ایک میں ہوں، ہمارے لئے کافی ہے میں کیا قبر میں ساتھ لیکر جاؤنگا۔"

"اور اسی لئے شاید خدا تمہیں اولاد نہیں دیتا —— "

شادی کے کئی سال بعد تک شیخ صاحب کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی، لوگوں نے لاکھ کہا کہ دوسری شادی کر لو، اُنہوں نے خاندان کے کئی ایسے واقعات بتائے جہاں لوگوں نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دو، دو، تین، تین شادیاں کیں اور اچھی بھلی اولاد کے ہوتے ہوئے —— ان کے ماموں کی تین بیویاں تھیں اور ان کی پھوپھی بھی تو تیسری جگہ تھیں اور ان سب نے خود آکر ان سے کہا مگر شیخ صاحب کو اپنے خدا پر بھروسہ تھا، اُنہوں نے ان کی بات نہ مانی اور کہا کہ اگر اللہ نے چاہا۔ تو اسی بیوی سے اولاد ہوگی ——

اور جب اللہ نے چاہا تو اسی بیوی سے اولاد ہوئی —— یہی لڑکا افتخار علی، شیخ صاحب نے خدا کا شکر کیا اور ان سب لوگوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا، مگر چند ہی دن بعد اسکی ماں کی صحت بگڑنی شروع ہوگئی بتیرا علاج معالجہ کیا مگر موت کا علاج کس کے پاس ہے بے چاری چند روز کے بعد چل بسی۔

شیخ صاحب یہ کہانی کئی بار سنا چکے تھے۔ کبھی یہاں سے، کبھی ہاں سے، مگر وہ اس کہانی کو کچھ اس طرح سناتے کہ ہر بار نئی معلوم ہوتی اور یوں ٹکڑوں میں بار بار دہرائی ہوئی یہ کہانی گراں گزرنے کی بجائے اچھی خاصی دلچسپ معلوم ہوتی —— اس میں کچھ شیخ صاحب کے طرزِ بیان کا بھی اثر تھا، ان کی آواز میں متانت اور گہرائی تھی اور وہ حقے کی نے ہاتھ میں تھامے کش لگانے کے درمیان باتیں کئے جاتے اور ساتھ والے حقے کی باری بھی بھول جاتے اور کبھی کبھی دھری دھری چلم بھسم ہو جاتی۔ اور نے شیخ صاحب کے ہاتھ میں ہی رہتی اور جب بات ختم کر کے شیخ صاحب دم کھینچتے تو چلم میں تمبا کو جل چکا ہوتا اور آگ سرد ہو چکی ہوتی

"کیا عورت تھی افتخار کی ماں" شیخ صاحب ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہتے۔ "مرتے وقت مجھ سے کہنے لگی "ناصر! بچہ تمہارے حوالے ہے زندگی یونہی ضائع نہ کرنا، شادی کر لینا" —— اس کی زندگی میں بھی جب لوگوں نے مجھ سے دوسری شادی کے لئے زور دیا تو ایک دن اُس نے بھی مجھ سے کہا کہ "اگر آپ بھی یہی چاہتے تو میں تو مجھے" —— اور اسکے بعد وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر اس کی آنکھوں میں وہ بے چارگی تھی، وہ سپردگی تھی۔ کہ میرے جی میں آیا اسے بات مکمل نہ کرنے دوں، اپنے کانوں میں انگلی ڈال لوں یا اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، کہنے لگی۔ "اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاں اولاد نہ ہو —— اور ——،

"مگر" شیخ صاحب کہتے "میرے مولا کو یہ منظور نہ تھا، اولاد ہوئی۔"

"ہاں جی مولا کے رنگ نیارے ہیں، جسے جو چاہے دے اور جس سے جو چاہے چھین لے۔ ان کے ساتھی حکیم صاحب کہتے اور اپنی بات شروع کر دیتے اور بات ان دنوں سے شروع کرتے۔ جب ان کی دکان میں چند شیشیاں تھیں اور ہوتے ہوتے بات پیروں فقیروں اور درویشوں تک پہنچ جاتی، حکیم صاحب کو بھی درویشوں سے ملنے کا شوق تھا اور شیخ صاحب کو تو پیروں فقیروں سے خاص عقیدت تھی

"واہ حکیم صاحب" وہ اپنے سر کے تھوڑے سے بالوں یا کھونٹے گالوں کو کھجاتے ہوئے کہتے، "اتنے فقیر دیکھے ہیں مگر جو بات ہم نے فقیرا میں دیکھی وہ نہیں پائی کہیں اور، کسی سے دھیلہ نہیں لیا کبھی اور نہ کسی شخص کے گھر گئے مگر میں حیران ہوں کہ ان کے پاس پیسہ آتا کہاں سے تھا، کئی بار دیکھا کسی نے آکر فریاد کی، کوئی آکر رویا، گڑگڑایا، آپ نے دعا کی تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور کچھ نوٹ اس شخص کے ہاتھ میں تھما دیئے اور کہا کہ جا بیٹا کام کر، نیک کام میں لگا، اللہ بہتر کرے گا،

"ایکبار کیا ہوا، کہکر وہ حقے کا کش لگاتے، دو ایک بار کھانستے اور دھواں چھوڑتے ہوئے کہتے "ایکبار کیا ہوا کہ آپ باتیں کرتے کرتے دفعتہً خاموش ہوگئے اور جب پہنچے ہوئے آدمی، یوں خاموش ہو جائیں تو سمجھ لو کہ اسکے بعد کی بات بڑے کام کی ہوگی —— اور جب اُنہوں نے

دھیان سے آنکھیں کھولیں تو مجھے اشارے سے قریب بلایا ،

"ناصر !"،

"جی !"، میں نے عرض کیا ،

"تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے، فرمایا تمہاری ترقی کا حکم آیا ہے ،
اب تم صاحب کے ساتھ میز پہ بیٹھو گے"

میں حیران تھا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا جی، مجھ سے کئی آدمی اوپر
بیٹھے ہیں ، میرا نمبر کہاں"

"ہو گا بس ، حکم آیا ہے ——" میں نے پھر عرض کیا ۔ سائیں جی صاحب
میرے خلاف ہیں ۔ اور پھر مجھ سے ——" سائیں جی مسکرا دیئے ، بولے ناصر !
تجھے یقین نہیں آتا ، تو دیکھ لینا ، مولا کیا کرتا ہے ، دیکھنا تم اسکے رنگ ،
حیران کس بات پہ ہو ، اسکے گھر کس چیز کی کمی ہے ، —— ۔

اور خود ہی شیخ صاحب ان باتوں کا یقین دلانے کے لئے کہنا شروع
کر دیتے ، یہ آجکل کے لڑکے مذاق کرتے ہیں گو یہ بھی حکیم یہ ٹھیک ہے ، حکم تو
اوپر ہی سے آتے ہیں ، یہ دنیادی افسر کیا چیز ہیں ، بڑی سرکار کی اجازت ہو
تب قلم حرکت میں آتا ہے ان کا ، —— اب اس واقعے ہی کو لو ، افسر
میرے خلاف ، مجھ سے سینیئر آدمی بیٹھے ہوئے اور میری ترقی ہوئی ، ہوا یوں
کہ افسر کی اچانک تبدیلی ہو گئی ، ایک آدمی معطل ہو گیا اور نئے صاحب کو
میرا کام کچھ اس قدر پسند آیا کہ اس نے میری سفارش کر دی ۔

—— اور انہی پیر صاحب نے مجھے اولاد کی خوشخبری سنائی تھی ایسے
ہی دربار لگا تھا ، مریدوں کی مجلس تھی ، بیٹھے بیٹھے خاموش ہو گئے ، آنکھیں
بند کر لیں اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے مجھے لڑکے کی خوشخبری دی ۔ اور ساتھ
ہی کہا ،

"ذرا ہمت سے پرورش کرنا اسکی !"

—— اور خدا کی قدرت ، شیخ صاحب نے پر چھوٹی انگلی اور انگوٹھے
سے بدستور قبضہ جمائے درمیان کی انگلیوں کو اٹھاتے ہوئے بولے کہ اس
کی پرورش کا سارا بوجھ چند ہی دن بعد میرے سر پہ پڑا ——

"یہ رشتے دار بھی کیا بلا ہوتے ہیں" ، شیخ صاحب بات ختم ہوتے
ہی ایک اور موضوع چھیڑ دیتے " ابھی بے چاری کو آنکھیں بند کئے سال
چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے ۔ کہ میرے سر ہو گئے ، پھر سے شادی کر لو

اور وہ بھی اسی بچے کے لئے
"ناصر بچے کا خیال کرو "

" یہ کام عورت ہی کر سکتی ہے " بزرگوں نے کہا ۔

"جی ہاں " میں نے اکثر انہیں ایسا جواب دیا " اگر وہ عورت اس
کی ماں ہو "

"اور تمہیں معلوم ہی ہے " تم سب کی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ
کس طرح پرورش کی ہے اس کی ، کیا کیا مصیبت نہ اٹھائی ہے ، دن
کا چین گنوایا ہے ، راتوں کو جاگا ہوں ، یہ ذرا روتا تو میری جان آدھی
رہ جاتی ، اسے ذرا سی تکلیف ہوتی تو مجھے دنیا کا اہم سے اہم کام کرنا
بھی دوبھر ہو جاتا ، صبح ، شام حکیموں ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگاتا —— "
جیسے جیسے یہ لڑکا بڑا ہوتا گیا ۔ شیخ صاحب کی باتوں کی عمر بھی بڑھے
گئی اب وہ اسکے بچپن کی باتیں سنایا کرتے ، اس کی شرارتوں کا ذکر کرتے
کی تتلی باتیں دہراتے اور ہنستے ،

پھر شیخ صاحب کی باتوں میں اس کی سکول کی باتیں بھی شامل ہوتی
گئیں ، —— " اس بار افتخار جماعت میں اوّل آیا ہے " " اس بار افتخار
نے وظیفہ لیا ہے " —— اور شیخ صاحب اس کی کامیابی پر شہر کے
بہترین حلوائی سے لڈو بنواتے اور خود محلے میں سب کو بانٹتے پھرتے
اور اگر کوئی پوچھتا کہ کس تقریب پہ ہے ۔ شیخ صاحب ہنستے ہوئے انہیں
بتاتے " آپ کو معلوم ہی نہیں ، میرے افتخار نے ماشاءاللہ وظیفہ لیا ہے "
اور پھر افتخار نے بہت اچھے نمبروں پہ میٹرک کیا ، اسی بات کا
چرچا بھی کئی دن رہا ، بہت سے لوگوں نے شیخ صاحب کو مشورہ دیا ۔ کہ اسے
اب نوکر کروا دیا جائے مگر شیخ صاحب کو منظور نہ تھا ، وہ اپنے لڑکے
کو پڑھانا چاہتے تھے ، یہی رائے اسکے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی بھی تھی ۔ کہ لڑکا
بڑا ہونہار ہے ، اسے کالج کی تعلیم دلانی چاہیئے ، ہر چند شیخ صاحب کو
معلوم تھا ۔ کہ کالج کے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں ۔ مگر انہوں نے
نہ ہمت ہاری اور نہ ارادہ ترک کیا ، انہیں یقین تھا ۔ کہ ان کا بیٹا حالات کو
جانتے ہوئے کفایت سے خرچ کرے گا ، شیخ صاحب نے اسے کالج میں
داخل کرا دیا اور یونہی اس نے کالج کے دن گزار دیئے ، پھر شیخ
صاحب نے اسے دوسرے شہر کے ڈگری کالج میں بھیج دیا ——

"کہئیے شیخ صاحب، افتخار کا کیا حال ہے"، حکیم صاحب یا کوئی اور ہمسایہ شیخ صاحب کو آتا جاتا دیکھ کر سوال کرتا، "کوئی خط آیا اسکا؟" — اور شیخ صاحب اگر کسی ضروری کام کیلئے بھی جا رہے ہوتے تو کام کاج بھول کر وہیں کھڑے ہو جاتے "ہاں بھائی خوب اچھی طرح سے ہے، اللہ کا شکر ہے، میری محنت ٹھکانے لگ رہی ہے، بڑا ہونہار لڑکا ہے —"

اور ہمسایہ گویا شیخ صاحب کے منہ سے بات چھین لیتا، "اللہ اسے سلامت رکھے"

یا پھر شیخ صاحب کہتے، "نہیں بھئی خط نہیں آیا، خیر ہو، فرصت ہی نہیں ملتی ہوگی، کالج میں پڑھتا ہے نہ آخر، بڑی پڑھائی ہوتی ہے حکیم صاحب سنتے ہیں یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں —" شیخ صاحب دونوں ہاتھوں کے اشارے سے کتاب کی ضخامت بتانے کی کوشش کرتے،

پھر افتخار کے خطوں میں کمی واقع ہوتی گئی، شیخ صاحب کبھی کام کی زیادتی سمجھتے کبھی فرصت کی کمی اور کبھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے۔ کہ اب اسکا دل وہاں لگ گیا ہے اور وہ اسے کچھ نصیحتیں کرتے، نماز روزے کی پابندی کی ہدائت کرتے —— اور افتخار ان خطوں کو پا کر ایک عجیب سی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا، وہ ان باتوں کا کیا جواب لکھتا، ان باتوں کا خیال تو اسے ہمیشہ سے تھا، اس کی گھٹی ہی میں یہ چیزیں تھیں، وہ ان سے کیسے غفلت کر سکتا تھا پھر ان باتوں کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، کیا اعتماد کی کمی تھی؟ اس کا ذہن خود ہی اس سے انکار کر دیتا، شاید پیار کی زیادتی تھی۔ وہ پیار جو بچوں سے کیا جاتا ہے —— وہ ان خطوں کا کوئی جواب نہ دیتا اور شیخ صاحب خود ہی اس کی توجیہہ کرتے، شاید یہ وجہ ہو، شاید —— اور اگر کبھی افتخار خط لکھتا تو کبھی موٹی موٹی کتابوں کا ذکر کرتا اور کبھی بڑی بڑی ضروریات کا جو ان روپوں میں جو شیخ صاحب اسے بھیجتے تھے۔ پوری نہ ہو سکتی تھیں ——

ادھر شیخ صاحب کو پنشن مل رہی تھی، انہوں نے نوکری کی مدت بڑھانے کی درخواست دے دی،

"شیخ صاحب کیا کریں گے نوکری کی میعاد بڑھا کر، اب آپ آرام کیجئے —"

"بھئی ذرا افتخار کی تعلیم مکمل ہو لے، پھر مجھے آرام ہی آرام ہے"

شیخ صاحب جانتے تھے کہ افتخار کبھی فضول خرچ نہ ہو سکتا تھا، اس کی ضروریات واقعی زیادہ ہونگی۔ جو وہ ان کا تذکرہ کرتا ہے۔ انہیں امید تھی۔ کہ نوکری بڑھانے کی درخواست منظور ہو جائے گی۔ اور اسی لئے اُنہوں نے اسے بارہا تسلی دی کہ اسے گھبرانا نہ چاہئے تھا، ابھی جیسے کیسے بھی ہو گزارا کرنا چاہئیے —— اور افتخار نے واقعی خرچ کم کرنیکی کوشش کی، ہوسٹل چھوڑا، ہوسٹل سے روٹی کھانی چھوڑی۔ مگر اس کے باوجود وہ مطمئن نہ ہو سکا، اُس نے ہزار نہ گھبرانے کی کوشش کی۔ مگر شاید وہ سچ مچ گھبرا گیا تھا۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار وہ ایک امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا، اس بات سے شیخ صاحب کو بڑا صدمہ ہوا، انہیں یقین نہ آتا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا تھا کئی دن تک شیخ صاحب کھوئے کھوئے سے رہے اور یہ اور بھی مشکل تھی کہ اس کا اظہار وہ کسی سے نہ کر سکتے تھے، ان کی طبیعت ہی گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ کسی سے کہیں افتخار کامیاب نہ ہو سکا تھا

اور اس بار افتخار گھر آیا تو نہ اُسنے شیخ صاحب سے آنکھ ملائی۔ اور نہ شیخ صاحب ہی کھل کر بات کر سکے، نہ باپ نے پوچھا کہ وہ کیوں پاس نہ ہو سکا تھا اور نہ ہی بیٹے نے کوئی وجہ بتانا مناسب سمجھی۔ مگر اپنی اپنی جگہ دونوں پریشان تھے۔ کہ کیسے دوسرے کو سمجھائے۔ کہ یہ کوئی بہت بڑا واقعہ نہ تھا۔ اور وہ اسے برداشت کر سکتا تھا۔ مگر کسی نے بھی کچھ نہ کہا، کشیدگی تیز تر ہو گیا اور دونوں گھٹے گھٹے سے رہے ——

افتخار کو اس بار گھر بڑا سونا سا نظر آیا، بچی کھچی چند چارپائیاں تھیں، دو ایک لکڑی کے پرانے تخت تھے اور یہ سب گویا ایک دوسرے سے مُنہ بسورے پڑے تھے، یہ مجبور سی خاموشی اور اداسی اسے بڑی عجیب سی محسوس ہوئی جیسے ویرانے میں چلا آیا تھا، کئی بار اُسے خیال آیا کہ گھر میں کوئی ایسا شخص ہونا چاہیئے تھا۔ جس سے وہ کچھ کہہ سکتا۔ جو باتیں اسے شیخ صاحب سے کہنا تھیں اسے کہہ دیتا تاکہ وہ شیخ صاحب تک پہنچ جاتیں مگر وہاں تو وہی اداس سی چارپائیاں تھیں، جیسے وہ کسی اجنبی سرائے میں آگیا تھا ——

شیخ صاحب سے اگر کسی نے گھر کی ویرانی کا ذکر بھی کیا تو انہوں نے بات ٹال دی، اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اور اگر کچھ کہا بھی تو یہی کہ بھئی یہ کام، گھر سجانا، چیزوں کو ٹھکانے سے رکھنا اور یہ سب ایسے کام

عورتوں کے کرتے کے ہوتے ہیں۔ میں اکیلی جان کیا کیا کروں، افتخار تعلیم سے فارغ ہو جائے گا، اس کی شادی کر دونگا، گھر میں بہو آئے گی۔ تو گھر خود بخود سنور جائے گا،

"اور پھر" شیخ صاحب کہتے "میری آمدنی بھی تو کوئی ایسی زیادہ نہیں، مہنگائی کے زمانے میں یہ تھوڑی سی تنخواہ بھی غنیمت ہے۔ کہ عزت سے گزر بسر ہو رہی ہے، لڑکے کی تعلیم پہ خرچ ہو رہا ہے —" اور یہ بات کچھ حقیقت سے بعید بھی نہ تھی، باپ دادا نے تو ساری کمائی اور جائداد اپنے کھیل تماشے میں ضائع کر دی تھی۔ اور شیخ صاحب نے جائداد بنانے والے کسی ذریعے کو اپنایا ہی نہ تھا، ورنہ اس نوکری سے بھی تو وہ بہت کچھ بنا سکتے تھے۔ اور ہر بات کو وہ "اللہ کا دیا یہی بہت کچھ ہے" کہکر ٹال دیتے،

اور اگر یہی بات افتخار کہہ دیتا اور ایسی بات اکثر ہو ہی جاتی تھی۔ جب وہ کالج سے واپس آتا کہ یہ تخت کیا بُرے سے معلوم ہوتے ہیں، کوئی میز ہی ہوتی۔ وہ ایک کرسیاں ہی ہوتیں، کوئی دوستوں کو بٹھا ہی سکتا — تو شیخ صاحب ناراض ہو جاتے،

"تمہارا خیال ہے میں تمام عمر گلچھرے اڑا تا رہا ہوں، میاں خود کماؤ گے تو پوچھیں گے کیا حال ہوتا ہے! کسی نواب کے یہاں تو پیدا نہیں ہوئے تھے تم، یہی کافی ہے کہ تم پڑھ رہے ہو ورنہ میری تنخواہ کیا ہے؟ کبھی سوچا بھی ہے؟" اور افتخار کے پاس سوائے خاموشی کے اور کیا تھا کہ جواب دیتا اسے معلوم تھا کہ اس سے کم تنخواہ والے شخص بھی اپنے بچوں کو ویسی ہی تعلیم دلوا رہے تھے۔ مگر اپنے والد کا فقرہ بھی اسے معلوم تھا کہ "عزت سنبھالے رہو، ایمان قائم رہے، تنگی سہی، یہی بہتر ہے —"

افتخار کئی دن گھر میں رہنے کے بعد واپس چلا گیا، وہ شیخ صاحب سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، کئی بار اس نے پیرا یہ بھی سوچا مگر والد کو یوں دیکھ کر اسے ہمت نہ ہو سکی — اور جس بات نے اس کی زبان پکڑ لی تھی۔ اسی نے قلم بھی تھام لیا، اسی لئے واپس جانے کے بہت دیر بعد تک اس نے گھر خط تک نہ لکھا،

اور اب شیخ صاحب ہمسایوں سے اس کے خطوں کی کمی کی شکایت بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ اس کی ناکامیابی کی بات ان کے نہ بتانے کے باوجود انہیں معلوم تھی اور وہ کہنے لگے تھے کہ اس نے وہاں جا کر عادات بدل لی ہونگی، عیش کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ اور انہیں اس بات سے بہت دکھ ہوتا تھا، وہ یہ نہیں سکتے تھے، کچھ بھی ہو افتخار ایسا نہیں ہو سکتا، "ورنہ وہ فیل کیسے ہو گیا؟" وہ کہتے

"سو باتیں ہو سکتی ہیں، صحت کی خرابی ہو سکتی ہے، بیچارا خدا جانے کہاں سے روٹی کھاتا ہے، کیسا گھی ہوتا ہے، کیسا دودھ، آجکل شہروں میں الابلا سی چیزیں ملتی ہیں ہوٹلوں میں — اور جب تک انسان کی صحت ٹھیک نہ ہو وہ کام کیا خاک کر سکتا ہے —"

اور ایسی ہی باتیں شیخ صاحب اپنے خطوں میں اسے لکھ دیتے کہ یہ کیا کرو، وہ نہ کیا کرو، صحت کا خیال رکھو — اور افتخار جھنجلا اُٹھتا کہ آخر اسے ابھی تک بچہ کیوں سمجھا جا رہا تھا؟ اسے خود سوچنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا تھا، اسے بھی اپنی ضروریات کا احساس تھا، اس کی اپنی بھی کوئی رائے تھی، جب کبھی اس نے اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی، اسے دبا دیا گیا تھا، اگر اس نے گھر کی کسی بے قاعدگی کا ذکر کیا تھا۔ تو اسے کہا گیا شہر میں جا کر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب خود گھر بسائیگا تو حقیقت معلوم ہوگی، اس گھر میں تو یہی کچھ ہے، یہی کچھ تھا، بڑی بات ہے۔۔ وہ یہاں چھٹیوں میں بھی نہ آیا کرے ——

اور جب وہ چھٹیوں میں بھی گھر نہ آتا تو اسے تمام پرانی باتیں یاد دلائی جاتیں اور اس کی سرد مہری کا گلہ کیا جاتا اور وہ بے بس ہو کر چلا آتا مگر آ جاتا تو وہی بات، وہ کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتا۔ اور شیخ صاحب اسے پھر وہی جواب دیتے ——

"خود کماؤ گے تو پوچھیں گے۔"

بُرا ہو یا بھلا وقت رُکتا کب ہے، یہ وقت بھی کٹ گیا، افتخار تعلیم سے فارغ ہو گیا، پھر اسے ملازمت بھی مل گئی وہ خود کمانے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ کام کس قدر مشکل تھا اور اس میں ایماندار رہنا اس سے بھی کتنا کٹھن، شیخ صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے، اسے ان باتوں کے جواب میں کبھی اپنی باتیں یاد آ جاتیں۔ تو وہ بہت شرمندہ ہوتا۔ مگر اب وہ کر کیا سکتا تھا، شیخ صاحب کی وہ ہمیشہ سے عزت کرتا تھا، اس میں اضافے کا سوال ہی تھا،

وہ برسرِ روزگار ہوا تو شیخ صاحب نے سوچا اس کی شادی کر دیں، اس آخری ذمے داری سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ افتخار اگر اب صبح کے ناشتے

کے لئے نوکر کا انتظام کرنے کو کہتا تو وہ کہتے، "جو لہا تو جبھی سجتا ہے جب کوئی عورت اسے جلائے، نوکر کیا خاک ٹھالے گا ــ" مگر افتخار اس پہ رضامند نہ تھا
تنخواہ کم ہے، یہ خرچ کم ہے، وہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا ــ ابھی نہیں، ابھی نہیں ــ شیخ صاحب تنگ آ گئے تھے، "میری تنخواہ کیا تھی، اور اس تنخواہ میں کیا کچھ نہیں کیا۔ آخر میرا اتنا بھی حق نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں،
ــ مگر بیٹے کو اس حق پر تو اعتراض نہ تھا، اسے تو اپنی ضروریات کا گلہ تھا ــ

"تمہیں خدا پر پورا بھروسہ نہیں، دینے والا تو وہ ہے۔ اور پھر جو جی آتا ہے۔ اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے ــ کیا خبر اسکے آتے ہی تیرے دن پھر جائیں ــ"

"یہ پرانی باتیں ہیں قبلہ!"
"اسی نے پڑھایا تھا مجھے ــ"
"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں ــ"
"خواہ مخواہ، مجھے جیسے سودا ہے، جنون ہے، تمہارا خیال ہے میں فضول بول رہا ہوں، میں خبطی ہو گیا ہوں ــ"
اب شیخ صاحب دراصل تھک چکے تھے۔ ان کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے، کہ افتخار گھر سنبھالے۔ اور وہ بس یادِ خدا کر سکیں۔ مگر ہوتا یہ کہ جب افتخار آتا ان کا صبح کا وظیفہ بھی غائب ہو جاتا، رات کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی۔ جس کے بعد وہ منہ سر لپیٹ کر پڑے رہتے اور صبح دیر تک سوئے رہتے ــ

ــ اور صبح اگر کوئی ہمسایہ اس کی وجہ پوچھ بیٹھتا تو شیخ صاحب گھٹنے گالوں کو کھجاتے ہوئے سر جھکا کر کہتے ــ

"میں نے اس لڑکے سے اتنی محبت کی ہے کہ اسکے خلاف کچھ کہتے ہوئے مجھے خود ہی شرم آتی ہے، اب میری ہر بات اسکے لئے پرانی ہے، میں فضول بولتا ہوں۔ اسکے خیال میں شاید میں خبطی ہو گیا ہوں ــ" اور بات کرتے کرتے شیخ صاحب اکثر آبدیدہ ہو جاتے، "خدا جانے یہ مجھے کہاں سے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اللہ سب کے گناہ معاف کرے ــ

مگر اس رات تو باپ بیٹوں کی باتیں خاصے طویل جھگڑے کی شکل اختیار کر چکی تھیں اور گئی رات تک وہ زور زور سے بولتے رہے تھے ــ

اور صبح جب دیر تک شیخ صاحب کی آواز سنائی نہ دی اور دن چڑھے تک شیخ صاحب کی شرمندہ شرمندہ صورت نظر آئی تو حکیم صاحب نے مشکوک نظروں سے ساتھ والے ہمسائے سے پوچھا، ہمسائے نے بھی نظریں اپنے ساتھ والے کی طرف پھیر دیں ــ

بہت دیر کے بعد جب وہ ان کے یہاں گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب رات ہی رات میں وہاں سے جا چکے تھے، کہاں؟ یہ افتخار کو بھی معلوم نہ تھا، شاید اپنے ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کیلئے ــ!

(بقیہ صفحہ ۷۷)

وہ میرا بچہ ہے۔ جو میری گود میں ہمکنے کے لئے ترس گیا ہے، وہ میرا گھر ہے۔ جس پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں ــ" لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ وہ اپنے ہی جیسے اُن بے شمار لوگوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جو سرحد کے آر پار دونوں طرف اس سنگین دیوار سے سر پھوڑ رہے تھے، اُن بے شمار فاطماؤں کے متعلق سوچتا رہا۔ جن کی آنکھیں منجمد ہو گئی تھیں ــ اُن گھروں کے متعلق سوچتا رہا۔ جن پر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں ــ!!

وہ سوچ رہا تھا۔ اور اُس کی حسرت بھری نگاہیں۔ اُس کے اوپر پھیلے ہوئے وسیع آسمان کے نیلے سینے میں جمی ہوئی تھیں ــ جہاں پاکستان کے کوے ہندوستان جا رہے تھے ــ ہندوستان کے کوے پاکستان آ رہے تھے ــ!! کوئی سنتری اُن کی راہ روکے نہیں کھڑا تھا ــ اُن کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں تھی ــ!!

صبح صادق حمید

دیوار

"میں پناہ گزین ہوں بابو!"

بابو خاموش رہا۔

"بابو! میں پناہ گزیں ہوں بابو!" وہ پھر گڑگڑایا

"تو میرے کپڑے اتار لو نہ پھر۔" بابو نے نہایت کٹیلی پنجابی میں اُسے کہا۔

اور اُس کا جی چاہا۔ کہ وہ اس کے کپڑے تو کیا اُس کی چمڑی بھی اُتار لے —— لیکن اُسے پرمٹ لینا تھا۔ ہندوستان جانے کا پرمٹ، اپنے گھر جانے کا پرمٹ! —— وہ ہاتھ پھیلائے کھڑا رہا۔

"دیکھتے کیا ہو؟ لے لونا، لو یہ لو،" بابو نے اپنا کوٹ اتار دیا—

"کیوں پسند نہیں آیا یہ؟ —— یار تم ہی اسے اپنی اچکن اتار دو" وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "پناہ گیر ہے یہ!" ——

اور اُسے دفتر سے باہر دھکیل دیا گیا — اپنے بے نیاز خدا کا شکر ادا کرتا ہوا وہ باہر نکل آیا، کہیں انہیں ایسی آزادی نہیں مل گئی، جس میں کھانے کے لئے بھی پرمٹ کی ضرورت ہوتی — جس میں سانس لینے کے لئے بھی پرمٹ لینا پڑتا —! اور اُسے اپنے ربِ عظیم کی ہستی عظیم تر محسوس ہونے لگی۔ جو دیتا ہے تو بغیر پرمٹ کے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ اور نہیں دیتا تو نہیں دیتا — اندھے بادل! — جو سمندروں پر برستے ہیں۔ مگر ویران اور مرجھائی ہوئی کھیتوں پر سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں!!

یہی امید لے کر وہ ہر روز اس دفتر میں آتا رہا تھا کہ اندھے بادل شاید کبھی بھولے سے اُس پر بھی جھک جائیں — ایک مہینے سے اس بنی بنائی تین میل لمبی سڑک پر وہ جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا کہ شاید اُسے اپنے گھر جانے کا پرمٹ مل جائے۔ لیکن اُسے اب تک دھکوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔

۱۵ اگست سے پہلے دفتر کے دوسرے چپراسیوں کے ساتھ اُس نے بھی لکھ کے دیدیا تھا۔ کہ وہ پاکستان جائیگا، نئی نئی جگہیں دیکھنے اور اپنے ملک کی خدمت کرنے کی تمنا لے کر اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اب نئی دہلی کی چمکتی ہوئی ہموار سڑکوں کی بجائے وہ منٹگمری کے ایک دور افتادہ گاؤں میں مرکزی حکومت کے ایک ملازم کا چپڑاسی تھا جہاں سب اجنبی تھے، جہاں ہر وقت لو کے جھکڑ چلتے تھے، جہاں ہر طرف ریت ہی ریت تھی!

وہ گورکھپور کا رہنے والا تھا اور دہلی میں ملازم تھا۔ جب اُس نے گھر خط لکھا کہ اُس نے پاکستان جانے کے لئے لکھ دیا ہے تو اُس کا باپ اُسے منع کرنے کے لئے آیا، اُس کی بیوی نے اُسے منت بھری چٹھیاں لکھیں۔ لیکن اُس نے اُن کی باتیں ہنسی میں ہی اڑا دیں۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ حالات کبھی اتنے بھی بگڑ جائیں گے۔ اور پھر اُسے اپنے نوزائیدہ ملک کی خدمت کا جذبہ بھی بے چین کئے دے رہا تھا —— اپنے ضعیف باپ کو تسلیاں دے کر اُس نے واپس بھیج دیا۔ اور اپنی بیوی کو لکھ بھیجا کہ وہ پاکستان جانے سے پہلے اُسے ضرور ملنے آئیگا۔

لیکن پھر ایک دم ہر طرف ایک عجیب ہراس پھیل گیا۔ لوگ گھروں میں ہی مقید ہو کر رہ گئے اور باہر نکلنا تک محال ہو گیا۔ اور آزادی کے روز اپنے گھروں میں ہی بیٹھے اُنہوں نے جشنِ آزادی کا شور و غل سُنا اور اُس جشن کا تصور کرتے رہے۔ جو اُن سے دور، بہت دور ایک نئی دھرتی پر آج ہی کے روز منایا جا رہا تھا —— اور آج اس نیم

برِّ اعظم کی طرح دہلی بھی تقسیم ہو کر رہ گئی تھی، —— دہلی جو چراغاں تھی، جہاں ہر کوئی بدمست تھا، اور دہلی جس پر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، جہاں لوگ سہمے ہوئے کونوں میں ڈبکے پڑے تھے! —— دہلی جس کی مردہ رگوں میں نئی زندگی کے ٹیکے دیئے جا رہے تھے اور دہلی جس میں سانس لینے کی اجازت "سلب" کی جا رہی تھی —— ! دہلی جو پیدا ہو رہی تھی، دہلی جو مر رہی تھی!!

کتنے ہی روز اُسے گھر میں بند رہنا پڑا، مختلف محلے مورچے بن کر رہ گئے، شہر میں ہر جگہ دھماکے بڑھتے گئے۔ دھوئیں کے تاریک بادل گہرے ہوتے گئے۔ اور دہلی جو پیدا ہو رہی تھی جنم لینے سے پہلے مر گئی!

ہر طرف سے لپکتے ہوئے خنجروں کی چھاؤں میں وہ ہمایوں کے مقبرے تک پہنچا۔ جہاں پناہ گزینوں کا کیمپ تھا —— اُس نے ارادہ کیا۔ کہ وہ گھوڑ کھیوڑ چلا جائے، لیکن اُس سے اتنی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ ایک عجیب سا نفرت کا احساس ایکدم سے اُسکے دل میں اپنی جنم بھومی کے خلاف پیدا ہو گیا تھا —— جہاں اُس نے اپنی عمر کے پچیس (۲۵) سال گزارے تھے، جہاں کی گلیوں میں ابھی تک اُس کا شریر بچپن اُسے چوکڑیاں بھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جہاں اُس کا ضعیف باپ تھا، جہاں اُس کی بیوی تھی، اُس کا پیارا سا معصوم بچہ تھا' —— اس کے باوجود وہ وہاں نہ جا سکا۔ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں پہنچ کر وہ اپنے باپ، اپنی بیوی اور پیارے سے بچے کو بلا لے۔ جہاں وہ ایک نئی پُر امن زندگی کی بنیاد رکھ سکیں، جہاں سب دوست ہوں، جہاں کوئی دشمن نہ ہو! —— کئی روز تک وہ اپنے گھر میں بند پڑا رہا۔ اپنے دروازوں کی اوٹ میں سے ڈرتے ڈرتے جھانکتے ہوئے اُس نے کئی دفعہ امدادی لاریوں کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ اُسکے حقیر سے مختصر دروازے پر ایک مرتبہ بھی نہ رُک سکیں، یہ لاریاں جو صرف بڑی بڑی کوٹھیوں کے شاندار برآمدوں سے ہمایوں کے مقبرے تک اور ہمایوں کے مقبرے سے بڑی بڑی کوٹھیوں کے شاندار برآمدوں تک چلتی تھیں۔ زمین کے ساتھ چمٹے ہوئے گھروندوں کے پاس ایک دفعہ بھی نہ رُک سکیں، ایک دفعہ بھی حقیر مختصر دروازوں کی زندگی کے ساتھ رابطہ قائم نہ ہو سکی!! —— ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس نے اپنے ماتھے پر ایک تلک لگایا۔ اور خون سے لتھڑی ہوئی سنسان سڑکوں پر کانپتا لرزتا ہوا وہ ہمایوں کے مقبرے تک پہنچ گیا —— ماتھے پر صرف ایک تلک لگا کر وہ جیسے انسان بن گیا! پندرہ اگست کے بعد کا انسان!!

اور جمنا کے کنارے وہ اُن بے شمار لوگوں میں آ ملا جو نئے شاہوں سے مایوس ہو کر شاید اپنے پرانے شاہوں کو جگانے چلے آئے تھے! نئے شاہ جنہیں اپنی موت یاد نہیں تھی۔ پرانے شاہ جو جاگ اُٹھنے سے معذور تھے —— !! اور اُن کے درمیان وہ بے شمار انسان بھٹک رہے تھے۔ جنہیں بھیڑوں کی طرح وہاں دھکیل دیا گیا تھا، جو اگر چاہتے تو نئے شاہوں کو موت بھی آ جاتی، پرانے شاہ جاگ بھی اُٹھتے —— !

وہیں اُسے ننگی دھرتی پر سونے کے لئے ایک بوسیدہ سے خیمے میں جگہ مل گئی۔ وہیں اُسے دو مہینے گزارنے پڑے۔ اُن کے سامنے ہی مقبرے کی اوپر کی منزل میں وہ لوگ بستے تھے۔ جو بڑی بڑی کوٹھیوں کے شاندار برآمدوں سے امدادی لاریوں پر یہاں تک پہنچے تھے۔ جہاں سے وہ سخت زمین پر لیٹے ہوئے اب بھی نغموں کی آوازیں سنتے تھے۔ جہاں اب بھی ریڈیو بجتے تھے۔ جہاں سے اب بھی گھنگروں کی چھاچھن کی صدائیں آتی تھیں —— ! اور وہ اپنے ساتھ لایا ہوا آٹا خود ہی پکا کر، رکھا سوکھا کھاتا رہا اور اُس کے آس پاس پھیلے بے شمار لوگ پاکستان کے لدے ہوئے کھیتوں کی طرف آس لگائے بیٹھے رہے۔ اور پاکستان سے آنے والا خوراک کا ہر جہاز مقبرے کی اوپر کی منزل میں خالی ہوتا رہا —— ! آتا رہا، خالی ہوتا رہا، واپس جاتا رہا —— ان گنت لوگوں کی آس ٹوٹنے نہ پائی ——!!

دو مہینے تک اُسے وہیں رہنا پڑا۔ اور جب پناہ گزینوں کی گاڑیاں پاکستان جانا شروع ہوئیں۔ تو وہ بھی تیار ہو بیٹھا۔ لیکن جب دہلی سے اگلے ہی اسٹیشن پر پناہ گزینوں کی ایک سالم گاڑی قتل کر دی گئی۔ تو اُس کی ہمت، ٹوٹ گئی اور وہ وہیں کیمپ میں ہی گرا رہا۔ جیسے اُس کے پاؤں تلے سے آخری تختہ کھینچ لیا گیا ہو —— اور وہیں پڑا ہوا وہ سوچتا رہا کہ کاش وہ ہندوستان میں آنکھیں بند کرے اور جب آنکھیں کھولے تو پاکستان پہنچ چکا ہوں، کاش وہ ایک

ہی حیثیت، ایک ہی اڑان میں اپنی منزل تک پہنچ جائے، کاش —— لیکن کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔ ایک پناہ گزینوں کی گاڑی ہی میں اُسے روانہ ہونا پڑا۔

راستے میں اُسے ہر اسٹیشن پر ان گنت لوگ ملے جو اپنے گھر چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ڈیرے جمائے ہوئے تھے، جو پاکستان جانا چاہتے تھے —— راستے میں وہ اُسے لاتعداد ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کی گاڑیاں ملیں جن میں سہمے ہوئے بچے تھے، ذلیل کی گئی عورتیں تھیں۔ کٹے ہوئے مرد تھے، —— جن کی آنکھوں میں شکست کھائے ہوئے زخم خوردہ پندار کی جھلک تھی، جن کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور جو اُنہی کی طرح اپنا وطن چھوڑ آئے تھے —— ! اور اُسے شدید احساس ہوا جیسے اُن کے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہو، اور اُس کا جی چاہا کہ وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگنے والی گاڑیوں کو روک کر کھڑا ہو جائے اور چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو بتا دے کہ —— "ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، آزادی کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں —— ہم! جنہوں نے ان گنت صدیوں سے ایک دوسرے سے محبت کی ہے —— ہم نے دھوکے میں آ کر ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھایا تھا، ہم نے ماننگے کے نشے میں آ کر ایک دوسرے کی عزت اُچھالی تھی —— اس کا مداوا اب بھی ہو سکتا ہے! —— اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اب بھی ایک دوسرے کی نادانیوں پر مسکرا کر ایک دوسرے کو معاف کر دو اور اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ —— !" —— لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنے پاس سے گزرنے والی پناہ گزینوں کی گاڑیوں کو وہ چپ چاپ گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ اور اُس کی اپنی گاڑی پاکستان پہنچ گئی۔

اور جب لاہور کے وسیع اسٹیشن پہ گاڑی رُکی اور ایک مختصر سی گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر لے کر وہ نیچے اترا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ جنم لے رہا ہو، جیسے اُسے ایک نئی دنیا میں پہنچ دیا گیا ہو۔ جہاں اُسے اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ پھر سے تگ و دو کرنی تھی۔ اور اُس نے دیکھا۔ کہ اُس کے ساتھ ہی گاڑی سے اترنے والا ایک بوڑھا پاکستان کے جھنڈے کو دیوانوں کی طرح چوم رہا تھا۔ اور اُس کے بہت سے ساتھی رو رہے تھے —— اُس کا اپنا دل بھی بھر آیا —— شاید اس لئے کہ اُسے اپنا دور دراز کا وطن یاد آ رہا تھا، یا شاید اس لئے کہ اُسے اپنے پاس سے گزرنے والی لاتعداد گاڑیوں میں جانے والے بے شمار بدنصیب لوگ یاد آ رہے تھے۔ جو اس جھنڈے تلے امان نہ ڈھونڈ سکے —— !

اپنی مختصر گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر سنبھالے وہ باہر نکل آیا مسافر خانہ اور اُس کے آس پاس کی جگہ اُس جیسے ہی سینکڑوں لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ جو وہاں عرصے سے ڈیرے ڈالے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ تھکاوٹ سے اُس کے جسم کی رگ رگ دکھ رہی تھی۔ کئی راتوں سے وہ جاگ رہا تھا۔ وہیں اپنا قلیل سامان رکھ کے وہ سو گیا۔ اور جب وہ کئی گھنٹوں کی بے سُدھ نیند کے بعد جاگا۔ تو اُس کی مختصر گٹھڑی اور پھٹا ہوا بستر جا چکا تھا اور اُس کی جیبیں خالی تھیں —— ! اُس کے پیٹ کی نسیں جیسے ایک دم سے جاگ اٹھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اور اب شدت کی بھوک چمک اٹھی تھی اور اُس کی جیبیں خالی تھیں —— تب اُس نے زندگی کی پہلی بھیک مانگی! اپنے ساتھ ہی پڑے ہوئے ایک بوڑھے سے اُس نے باسی روٹی کا ایک ٹکڑہ مانگ کے کھایا اور پہلے سے زیادہ بے پرواہی کے ساتھ پہلے سے زیادہ بے سدھ ہو کر وہ پھر سو گیا —— !

اگلے دن وہ اپنے دفتر پہنچا اور اُسے دس روپے کا ایک نوٹ اور منٹگمری پہنچ جانے کا حکم مل گیا۔ اور وہ دس روپے کا نوٹ اپنی مُٹھی میں دبائے یوں خوش خوش باہر نکل آیا جیسے اس نئی دھرتی پر اُس کے شاندار مستقبل کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہو —— ! نئی زندگی کے نئے ارادوں کے ساتھ جھومتا ہوا وہ منٹگمری کے ریتیلے اور دور دراز کونے میں پہنچ گیا۔

دو تین مہینوں تک اُسے اپنے گھر بار والوں کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ اُس نے کئی خطوط گوردکھپور لکھے۔ اپنے باپ کو اور اپنی بیوی کو۔ لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے خبریں ملتی رہیں کہ

ہندوستان میں حالات بہت ابتر ہیں - اور اُس کی تشویش بڑھتی گئی ––– نہ جانے کیا ہوگا اُس کا باپ، اُس کا بچہ شاید اب باتیں کرنے لگا ہو اور فاطمہ ––– کیسے گزرتے ہونگے اس کے دن فاطمہ! جس کے ساتھ تھوڑا ہی عرصہ پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی ––– ریتیلے اداس ویرانوں میں پھرتا ہوا وہ فاطمہ کے متعلق سوچتا رہتا - اور اپنے خوشگوار ماضی کے دھندلکوں میں اُسے ایک تابندہ مشعل ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ تابندہ مشعل جس نے اُس کی بھٹکتی ہوئی حیات کو راہ دکھائی وہ فاطمہ جس کے ساتھ اُس نے بچپن کھیل کے گزارا اور جس کے شانوں پر سر رکھ کر اُس نے ایک مختصر عرصے کیلئے ایک چمکتے ہوئے مستقبل کے خواب بُنے ––– اُس کی ایک ایک شرارت اُسے یاد تھی۔ اُس کی ہر شرارت کا ذمہ وہ اپنے اوپر لے لیتا۔ وہ اُسے جلانے کے لئے ہمیشہ دوسرے لڑکوں سے کھیلتی۔ لیکن جب ایک مرتبہ گاؤں کے باغ سے آم چرانے پر اُس نے اپنے آپ کو پٹنے کے لئے پیش کر دیا۔ تو گویا وہ عمر بھر کے لئے اُسکے ہاتھوں بک گئی - اور شام کو جب وہ اپنے گھر کے سامنے بیٹھا تھا وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس پر جھک گئی۔ اور اُس کے خلوص بھرے گرم گرم آنسو دیر تک اُس کی چوٹوں کو سہلاتے رہے –––! تب وہ بالکل بچے تھے۔ لیکن پھر بچپن کا یہی بے نام سا کھیل اُن کی زندگی کا کھیل بن گیا ––– اور زندگی کی طویل اور کٹھن ڈگر پر وہ ایک دوسرے کا سہارا لئے پوری ثابت قدمی کے ساتھ چل دیئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُن کے ساتھ ایک نیا ہم سفر آن ملا اور اُن کے قدم پہلے سے زیادہ یقین کے ساتھ اٹھنے لگے اور انہیں اپنی منزل پہلے سے زیادہ قریب نظر آنے لگی –––

اور اب وہ راہی منتشر ہو گئے تھے۔ اُن کے ارد گرد ظلمتیں اور گہری ہو گئیں تھیں اور زندگی کی کٹھن ڈگر اور زیادہ کٹھن ہو گئی تھی۔ بہت عرصے تک وہ اُن کے متعلق سوچتا رہا۔ انہیں خط لکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن بالکل اچانک اُسے اپنے ایک خط کے جواب میں فاطمہ کا خط مل گیا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے ارد گرد پھیلی ہوئی ظلمتیں جگمگا اٹھی ہوں۔ جیسے ان اداس ویرانوں میں جان پڑ گئی ہو۔

اُس کی بیوی نے اُسے لکھا تھا۔ کہ وہ انہیں جلد اپنے پاس بلا لے۔ اُس نے لکھا تھا۔ کہ اُسے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ کہ منا اُسے بہت یاد کرتا رہتا ہے۔ اور اُس نے لکھا تھا۔ کہ اُس کا ضعیف باپ صرف اُس سے ملنے کی تمنا لئے موت کے دروازے پر کھڑا ہے اس لئے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ خود جاکر اُن سب کو پاکستان لے آئے۔ لیکن جب ایک ٹھٹھری ہوئی شام کو اُس نے خبر سنی کہ ہندوستان میں گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا۔ تو اُس کا ارادہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ ایک عرصے تک اُسے ہمت نہ ہو سکی۔ کہ وہ ہندوستان جانے کے متعلق سوچے بھی۔ وہ انہیں جلد پاکستان بلا لینے کے وعدے ہی لکھتا رہا۔

جب کچھ عرصے کے بعد قدرے امن و امان ہو گیا۔ تو اُس نے انہیں لکھ بھیجا کہ وہ آ رہا ہے اور اپنی مختصر تنخواہ سے بچائی ہوئی رقم اپنی جیب میں ڈالے ہوئے وہ کراچی پہنچ گیا۔ اپنے بچے کے لئے کھلونے اور بیوی کے لئے ریشمی کپڑے خرید کر جب وہ بندرگاہ پر پہنچا تو اُسے نہایت نرمی کے ساتھ بتا دیا گیا۔ کہ وہ ہندوستان نہیں جا سکتا۔ اُس کے پاس انکم ٹیکس وغیرہ کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے –––! اُس کے بچے کے کھلونے اور بیوی کے ریشمی کپڑے اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور اُسے پہلی بار احساس ہوا۔ کہ اس بہت بڑے شہر اور اسکے معروف کھلے بازاروں میں اُس کا کوئی ایک بھی واقف کار نہیں تھا۔ جو اُسے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا۔ جو اُن لوگوں کو بتا سکتا۔ کہ وہ محض ایک چپراسی ہے۔ اور اُس سے انکم کے بغیر ٹیکس کس طرح وصول کیا جا سکتا تھا ––– اُسے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا ––– اور کلفٹن کے ریتیلے ساحل پر لیٹا ہوا وہ حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی چڑھتی اترتی ہوئی لہروں کو دیکھتا رہا ––– کاش وہ سوچتا رہا ان میں سے کوئی لہر بڑھے اور اُسے اٹھا کر بمبئی کے ساحل پر پھینک دے! ––– مگر کوئی لہر اُس تک نہ بڑھ سکی، سمندر بھی اُسے اپنی آغوش میں نہ لے سکا۔ مایوس ہو کر اُس نے اپنے بچے کے کھلونے اور اپنی بیوی کے کپڑے اُن لہروں کو سپرد کر دیئے –––! اور چند روز بعد

پانچ سو میل لمبے صحرا کی تمام ریت اپنے چہرے پر جمائے اپنی خالی جیبیں لئے وہ پھر انہیں ریتلے اداس ویرانوں میں واپس پہنچ گیا —— !!

ایک طویل عرصے کے لئے اُسے پھر ان ویرانوں میں رہنا پڑا اس تمام عرصے میں اُسے گھر سے کئی خط آئے۔ وہ بھی انہیں تسلیوں بھرے خط لکھتا رہا۔ اپنے افسر کے معصوم سے بچے کو وہ دن دن بھر اپنے کندھوں پر لئے پھرتا رہتا۔ اور اُس کی آنکھوں میں اپنا گول مٹول سا بچہ گھومنے لگتا۔ اور پھر اُسے فاطمہ یاد آتی، اُس کی محبت یاد آتی، اپنا بوڑھا باپ یاد آتا جو صرف اُس سے ملنے کے لئے زندہ تھا۔ اور وہ بے قرار ہو جاتا۔ اور اُس کا دل چاہتا کہ وہ اڑ کر اُن سب کے درمیان جا پہنچے —— لیکن دوسرے لمحے اُسے اپنی خالی جیبیں یاد آجاتیں۔ اُسے اپنی ملازمت کی مجبوریاں یاد آتیں اور اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ ایسا پرکٹا پرندہ ہو جو پنجرے میں رہے تو بھی قید رہے۔ اور اگر چھوڑ دیا جائے تو بھی اڑ نہ سکے !

ایک طویل عرصے کے بعد جب اُس کی جیب میں چار سکے کھنکھنائے اور جب اُسے رخصت ملی تو وہ لاہور پہنچا اور اُسے بتایا گیا۔ کہ اب ہندوستان جانے کے لئے پرمٹ لینا پڑتا ہے۔ اور اب مہینہ بھر سے وہ اس تین میل لمبی سڑک پر اس پرمٹ کیلئے پھر رہا تھا ——

"بابو! میں پناہ گیر ہوں بابو!"

خاموشی ——

"بابو! میرا بچہ، میری بیوی، میرا باپ ——"

اور خاموشی اب تک نہ ٹوٹ سکی تھی —— وہ ہر روز یہاں آتا تھا۔ ہر روز یہ امید لئے ہوئے کہ شاید اُسے پرمٹ مل جائے، شاید اندھے بادل بھولے سے اُس پر جھک جائیں اور اُس کے دل کی ویرانیوں میں بھی بہار آجائے۔ دن بھر وہ وہیں گزار دیتا اور ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ وہ اس طویل سڑک پر جوتیاں چٹخاتا واپس آجاتا —— اگلے روز پھر جانے کے لئے، نئی اُمیدوں کے ساتھ نئی توقعات کا طوفان لئے!

آج پہلی مرتبہ بابو نے اُس کی بات کا جواب دیا تھا۔ حقارت سے اُس نے اُسے اپنے کپڑے اتار لینے کے لئے کہا تھا —— اور اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ اُس بابو کی حقارت بھری آنکھیں نکال لے، وہ بابو!

جو اُس کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، جو ایک دیوار بن گیا تھا! ——

لیکن وہ چپ چاپ اپنے بھیلے ہوئے ہاتھ لپیٹ کے باہر نکل آیا اور اب وہ اپنے ربِ عظیم کا شکر کرتا ہوا جا رہا تھا اور ایک طویل ختم نہ ہونے والی سڑک، اُس کے سامنے تھی —— !

اگلے روز نہ جانے کیسے وہ سرحد پر پہنچ گیا۔ شاید یہ سوچ کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔ کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر شاید وہ اس سنگین دیوار کے اُس پار اُتر جائے، شاید کوئی بھٹکا ہوا بادل اُس کے دل کی ویرانیوں پر پسیج جائے —— لیکن اُس نے بند سڑک دیکھی، پہرے پر کھڑے ہوئے کرخت سپاہی کو دیکھا، اُس کی بل کھاتی ہوئی خوفناک گھنی مونچھیں دیکھیں، اُس کی بندوق پر لگی ہوئی چمکتی ہوئی سنگین دیکھی۔ اور اُسے جرأت ہی نہ ہو سکی۔ کہ وہ اُس سے بات بھی کر سکے ——

اُس کے سامنے سرحد پار کے درخت جھوم رہے تھے۔ اور شریر ٹہنیاں جیسے لہک لہک کر اُسے بلا رہی تھیں —— "آؤ، ہمارے پاس آجاؤ، اپنی فاطمہ کے پاس آجاؤ، اپنے بچے کے پاس آجاؤ، اپنے گھر کی طرف لوٹ آؤ —— تمہارے وطن کی گلیاں اب بھی تمہاری منتظر ہیں، تمہاری فاطمہ تمہاری راہ تک رہی ہے، تمہارا بچہ تمہاری گود میں مچلنے کو ترس گیا ہے —— آؤ! کوئی اپنے وطن کو نہیں بھول جایا کرتا، اپنی جنم بھومی نہیں بھلائی جا سکتی ——"

اُس کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ کہ فاطمہ بھی گورکھپور میں اس ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی ہوگی، نہ جانے کب سے وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی ہے —— ! نہ جانے کب تک اُسے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنا ہوگا —— !!

اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے سامنے بند سڑک پر تنے ہوئے سپاہی سے پوچھے —— "بھائی میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے تم پھر ہمارے درمیان حائل کیوں ہو گئے ہو؟ میرے اور میرے گھرانے کے درمیان تم دیوار کیوں بن گئے ہو —— ؟ تمہارے اُس طرف فاطمہ کھڑی ہے۔ جو میری راہ تکتے تکتے تھک گئی ہے،

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

ابو سعید قریشی

افسانچے

سوال

میرے دوست نے اپنی سائیکل کو تالا لگاتے ہوئے کہا۔
دنیا میں کوئی ایسا ملک بھی ہے۔ جہاں سائیکلوں کو تالے نہیں لگانے پڑتے؟

دم دار ستارہ

نگاہیں افق پر تھیں اور ہاتھ دلوں پہ
ایک نے کہا: "بادشاہ کے لئے نحس ہے"
دوسرے نے کہا: "نہیں رعیت کے لئے"
جھگڑا ختم ہوا۔ دونوں حوالات میں تھے۔

اپنا اپنا کام

"انہیں دیکھ رہے ہیں نا آپ؟"
ادھیڑ عمر کا ایک اندھا اور چھ سات سال کی ایک لڑکی بس کے کونے میں دبکے بیٹھے تھے۔ کنڈکٹر نے اُن کے ٹکٹ کاٹے اور آگے بڑھا
"آج تک انہیں کبھی دیر نہیں ہوئی۔ ہمیشہ اسی بس سے جاتے ہیں"
"خوب!"
"شام کے آٹھ بجے تک امپیریل بنک کے سامنے بھیک مانگیں گے۔ سوا آٹھ کی بس سے واپس —— جمعہ کو چھٹی کرتے ہیں"

اور گٹھلیوں کے دام

سٹار کا نامہ نگار مقیم سنگاپور رقمطراز ہے۔ کہ لاشوں کی کمی کی وجہ سے ایڈورڈ ہفتم میڈیکل کالج میں اناٹومی کی تعلیم میں خاصی رکاوٹ پیش آرہی ہے۔ کالج کے ایک پروفیسر نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ سنگاپور کے لوگوں نے ٹیلیفون پر دریافت کیا تھا۔ کہ اُن کی اپنی یا اُن کے رشتہ داروں کی لاشوں کی اُنہیں کیا قیمت دی جائے گی۔ لیکن جب اُنہیں بتایا گیا کہ لاشوں کی کوئی قیمت نہیں دیجاتی۔ تو اُنہوں نے لاشوں کا چندہ دینے سے انکار کر دیا۔

میرزا ادیب

محبوبہ

کردار

لڑکی ——————
شہزادہ ——————
شہنشاہ ——————
بیگم ——————
رانی ——————

منظر:- (ایک باغ جو اس قدر شاندار ہے۔ جس قدر ایک شہنشاہ کے باغ کو ہونا چاہیئے۔ یہ باغ چونکہ شہنشاہ اور اُس کے خاندان کی خاص تفریح گاہ ہے اسلئے شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ کوئی اور شخص یہاں آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس وقت صبح کا وقت ہے۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا ہے۔ ادھر ادھر شبنم آلود پھولوں اور پتیوں کے ارد گرد ہلکی ہلکی روشنی کا ایک غبار سا چھا رہا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گلاب کے کنج کے پاس آتی ہے، پھولوں پر نظر ڈالتی ہے اور ایک دو لمحے رُکنے کے بعد جانے لگتی ہے۔ یہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ خد و خال ایرانی ہیں جن سے معصومیت ٹپک رہی ہے۔ عمر سولہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لڑکی نے ابھی قدم اٹھائے ہی ہونگے کہ دوسری طرف سے شہزادہ آتا ہے۔ شہزادہ نہایت قیمتی اور بیش بہا لباس میں ملبوس ہے۔ گلے میں ایک نہایت اعلیٰ ہار پہنے ہوئے ہے۔ جس کے ہیرے اُسکے سینے پر تاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ شہزادے نے دونوں ہاتھوں میں کبوتر پکڑ رکھے ہیں —— شہزادے کو آتے دیکھ کر لڑکی نظریں جھکا لیتی ہے اور تیزی سے قدم اٹھانے لگتی ہے۔ شہزادہ اُسے دیکھتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر کہ مالن کی بیٹی ہے اُسے بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ کنج کے پاس شہزادے کی نظر ایک خوبصورت گلاب کے پھول پہ پڑتی ہے۔ اُسکے قدم رُک جاتے ہیں اور وہ لڑکی کی جانب دیکھ کر آواز دیتا ہے۔ اُس کی آواز میں شاہی وقار اور رعونت ہے)

شہزادہ:- اے لڑکی! اِدھر آؤ۔ (لڑکی وہیں رُک جاتی ہے)

(لڑکی ایک دو لمحوں کے لئے کچھ سوچتی ہے پھر شہزادے کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے)

لڑکی:- جی!

شہزادہ:- ہمیں پھول توڑنا ہے۔ یہ کبوتر پکڑ رکھو۔

(لڑکی کبوتر پکڑ لیتی ہے۔ شہزادہ پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لڑکی کے ایک ہاتھ سے کبوتر نکل کر فضا میں اڑ جاتا ہے۔ شہزادہ مڑ کے دیکھتا ہے)

لڑکی:- اوہ۔ کبوتر اڑ گیا۔

شہزادہ:- تم نے مضبوطی سے نہیں پکڑ رکھا تھا کیا؟ —— بدتمیز کہیں کی۔

لڑکی:- مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

شہزادہ:- پھر کیوں اڑ گیا۔

لڑکی :۔ (دوسرا کبوتر خود چھوڑتے ہوئے معصومانہ انداز میں) یوں —— (شہزادہ اس کی جانب دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ لڑکی کی طرف آتا ہے)

شہزادہ :۔ بہت خوب —— کتنی دلآویز ادا ہے تمہاری

لڑکی :۔ آپ خفا ہو گئے ہیں —— میں کبوتروں کی قیمت ادا کر دونگی۔

شہزادہ :۔ تمہارا یہ جرم معاف نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں ہر حال میں ہمارے کبوتروں کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

لڑکی :۔ تو بتائیے قیمت۔

شہزادہ :۔ (لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر) یہ ہے کبوتروں کی قیمت

لڑکی :۔ (پریشان ہو کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا میں اپنا ہاتھ کیونکر دے سکتی ہیں۔ یہ تو میرا ہاتھ ہے۔

شہزادہ :۔ اور وہ ہمارے کبوتر تھے۔

لڑکی :۔ انہیں اڑنا ہی چاہیئے تھا۔ آزاد پرندوں کو گرفتار کرنے سے فائدہ؟

شہزادہ :۔ (شوخی سے) ہم تو تمہیں بھی گرفتار کر لیں گے۔

لڑکی :۔ اونہہ —— مجھے آپ گرفتار کریں گے۔

شہزادہ :۔ ہم تمہیں ضرور گرفتار کر لیں گے۔ اور تمہارے پر بھی نہیں ہیں۔ اڑ کیونکر سکو گی —— ؟

لڑکی :۔ مجھے کون گرفتار کر سکتا ہے بھلا۔

شہزادہ :۔ (اور متاثر ہو کر) کس قدر معصوم اور پیاری ادائیں ہیں تمہاری۔

لڑکی :۔ معاف کیجئے شہزادہ صاحب! میں محل میں رہنے والی کوئی کنیز نہیں ہوں۔

شہزادہ :۔ تم جو کچھ بھی ہو بڑی دلچسپ چیز ہو۔ افسوس ہم نے تمہیں پہلے کیوں نہ دیکھا۔ کہاں تھیں تم اب تک؟

لڑکی :۔ ہم لوگ ایران سے آئے ہیں

شہزادہ :۔ لڑکی تمہیں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیئے۔

لڑکی :۔ وہ کیوں؟

شہزادہ :۔ کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں۔

لڑکی :۔ آپ باتیں ہی عجیب کر رہے ہیں، خاک سمجھوں —— ؟

شہزادہ :۔ ہمیں تم سے محبت ہو گئی ہے۔ کیونکہ تم بہت بھولی بھالی اور پیاری لڑکی ہو۔

لڑکی :۔ اور مجھے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی دوسری کنیزوں کی طرح ایک کنیز سمجھ رہے ہیں۔

شہزادہ :۔ لڑکی :۔ ہم شہزادے ہیں۔

لڑکی :۔ جبھی تو آپ مجھے کنیز سمجھ رہے ہیں۔

شہزادہ :۔ ہم تجھے اپنی محبوبہ سمجھتے ہیں۔

لڑکی :۔ شہزادوں کی کنیز اور محبوبہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شہزادہ صاحب!

شہزادہ :۔ تم بہت گستاخ ہو۔

لڑکی :۔ آپ مجھ پر رعب کیوں جما رہے ہیں۔ کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا۔ دو کبوتر اڑ گئے ہیں۔ ان کی قیمت لے لیجئے —— مہربانی کر کے اب میرا ہاتھ نہ پکڑیئے۔ یہ مشغلہ محل کے اندر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

شہزادہ :۔ تم بار بار ہماری توہین کر رہی ہو۔ مگر تمہاری ادائیں ہمیں اس قدر پسند ہیں کہ سزا دینے کو جی نہیں چاہتا! —— آخر تمہیں بادشاہوں سے نفرت کیوں ہے ——؟

لڑکی :۔ بادشاہوں کے پاس دولت کے سوا اور ہوتا کیا ہے۔ لوگوں کو لوٹ لوٹ کر ساری دولت اپنے گھر میں جمع کر لیتے ہیں —— اور پھر اسی دولت کے بل بوتے پر لوگوں پر حکومت کرتے ہیں شاندار محلات بناتے ہیں۔ باغات لگواتے ہیں۔ لڑائیاں کرتے ہیں اور لڑکیوں کو کنیزیں بنا لیتے ہیں۔

شہزادہ :۔ تمہاری پرورش کہاں ہوئی ہے لڑکی!

لڑکی :۔ کہہ تو دیا ایران میں۔

شہزادہ :۔ نہ جانے کیوں ہمیں تمہاری ہر ادا دلفریب معلوم ہوتی ہے، ایسی حسین، معصوم اور گستاخ لڑکی ہم نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ آؤ یہاں بیٹھ کر باتیں کریں!

لڑکی :۔ جی نہیں میں بیٹھ نہیں سکتی۔ گھر جانا ہے اماں انتظار کر رہی ہوگی۔

شہزادہ :- میں تمہاری ماں سے کہہ کر تمہیں محل میں لے جاؤنگا۔ جب تمہاری ماں سُنے گی کہ ہم تمہیں چاہتے ہیں۔ تو وہ خوشی سے جامے میں پھولی نہیں سمائے گی۔

لڑکی :- کیونکہ آپ ایک شہنشاہ کے بیٹے ہیں —— لاکھوں لوگوں کے ہونے والے حکمران ہیں —— ؟

شہزادہ :- تم نہیں جانتیں شہزادوں لڑکیاں ہماری چشمِ التفات کو حاصلِ حیات سمجھتی ہیں۔

لڑکی :- میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں!

شہزادہ :- بے وقوف۔ بدتمیز۔

لڑکی (مسکرا کر) بس!

شہزادہ عجیب لڑکی ہے۔

لڑکی :- آپ کو اب تک ان عورتوں سے واسطہ پڑا ہے جو کنیزیں پہلے ہوتی ہیں اور محبوبائیں بعد میں۔

شہزادہ :- اور تم —— ؟

لڑکی :- میں صرف ایک خوددار لڑکی ہوں —— پہلے بھی اور آخر میں بھی!

شہزادہ :- لڑکی۔ ہم ساری دنیا کی دولت تم پر نچھاور کر دینگے۔ ہمارے پہلو میں تمہیں ہر وہ نعمت حاصل ہوگی۔ جس کا تم تصور کر سکتی ہو!

لڑکی :- معاف کیجئے میں نعمتوں کا تصور کیا ہی نہیں کرتی!

شہزادہ :- تو پھر کیا کرتی ہو۔

لڑکی :- آپ کو میرے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

شہزادہ :- لڑکی! تو ہمیں پسند کیوں نہیں کرتی۔ ہمیں تم سے محبت ہے،

لڑکی :- اگر آپ شہزادے نہ ہوتے تو ضرور پسند کرتی —— آپ نے اب تک اپنے اردگرد دولت ہی دولت دیکھی ہے۔ انسانیت نہیں دیکھی۔ آپ باپ دادا کی طرح دولت کے انبار پر بیٹھ کر حکومت کرنا چاہتے ہیں لیکن محبت پر حکومت نہیں کر سکتے۔ محبت صرف انسانوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں میں پھلتی پھولتی ہے۔ شہنشاہوں، شہزادوں میں نہیں —— !

شہزادہ :- آج ہم شہزادے نہیں ہیں۔

لڑکی :- آپ کا لب و لہجہ، آپ کا لباس، آپ کا یہ ہار —— سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ شہنشاہ کے بیٹے ہیں —— آپ شہزادے ہیں۔

شہزادہ :- (گلے سے ہار اتار کر پرے پھینکتے ہوئے) یہ تو ہم نے ہار پھینک دیا۔ محبت کے معاملے میں ہم شہزادے نہیں ہیں۔

لڑکی :- سچ! —— مگر آپ کا دل کیونکر بدل سکتا ہے۔

شہزادہ :- میں بدل چکا ہوں لڑکی! —— تم مجھے جس طرح چاہو آزما سکتی ہو۔ میں ہر آزمائش کے لئے تیار ہوں!

لڑکی :- کہیں آپ خواب تو نہیں دیکھ رہے؟

شہزادہ :- نہیں —— آج میں صرف انسان ہوں —— شہزادہ نہیں ہوں!

لڑکی :- تو اب میں تمہارے پہلو میں بیٹھ سکتی ہوں —— تم سے باتیں کر سکتی ہوں :- کیونکہ اب تم تخت پہ بیٹھ کر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ بلکہ اپنے آپ کو صرف انسان سمجھ کر میرے پاس کھڑے ہو۔

شہزادہ :- کیا ہم ہر روز یہاں ملا کریں گے؟

لڑکی :- ہر روز تو نہیں —— کبھی کبھی —— ٹھیک ہے نا!

شہزادہ :- نہیں ہر روز —— تم ملو گی نہیں تو مجھے تمہاری فرقت میں تڑپنا پڑے گا —— ہم تمہیں ایک محل بنا دینگے۔ جہاں تم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرو گی۔

لڑکی :- تم پھر شہزادوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

شہزادہ :- اوہ معاف کرنا۔

لڑکی :- میں معاف نہیں کر سکتی۔

شہزادہ :- آئندہ ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکالونگا!

لڑکی :- چلو معاف کر دیا۔

شہزادہ :- (دور کسی کو آتے دیکھ کر) اوہ —— تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں —— ابھی آتا ہوں۔

لڑکی :- کہاں چلے؟

شہزادہ :- بس —— ابھی آتا ہوں۔

(شہزادہ تیزی سے چلا جاتا ہے۔ لڑکی وہیں کھڑی

رہتی ہے۔ شہنشاہ اپنی دو بیگمات کے ساتھ آتے ہیں
لڑکی انہیں دیکھ کر گلاب کے کنج میں چلی جاتی ہے۔ شہنشاہ
آتے ہیں۔ ان کی دائیں طرف بیگم ہے۔ اور بائیں جانب
رانی۔ بیگم عمر میں رانی سے کچھ بڑی ہے۔ دونوں حسین ہیں
مگر جو شادابی اور بشاشت رانی کے چہرے پر نظر آتی ہے
وہ بیگم کے چہرے سے مفقود ہے۔ شہنشاہ کنج گلاب کے
قریب آ کر رک جاتے ہیں۔ ان کی نظر گلاب کے پھول پر
پڑتی ہے)

شہنشاہ :- گلاب کا پھول بھی کیا پھول ہے۔ دنیا کا کوئی پھول خوبصورتی
میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا!

رانی اور بیگم :- (بیک آواز) جی حضور!

(شہنشاہ آگے بڑھ کر پھول توڑنے لگتے ہیں۔ ان کی انگلی میں
کانٹا چبھ جاتا ہے)

شہنشاہ :- ہماری انگلی زخمی ہو گئی ہے۔

رانی اور بیگم (بیک آواز) ہائے۔ (دونوں بھاگ کر ادھر جاتی
ہیں)

بیگم :- دکھائیے تو۔

رانی :- ہائے کتنا ظالم کانٹا ہے ——— حضور کی انگلی زخمی ہو گئی۔
طبیب کو بلاؤں جہاں پناہ!

شہنشاہ :- نہیں۔ بڑا زخم نہیں ہے۔

رانی :- میں قربان جاؤں کوئی تکلیف تو نہیں ہے حضور کو!

شہنشاہ :- رانی! بادولت تمہاری محبت سے بہت خوش ہوئے ہیں
تمہیں ہمارا بہت خیال ہے!

رانی :- حضور کی ذرہ نوازی ہے۔

(رانی بیگم کو تیکھے انداز سے دیکھتی ہے۔ بیگم کا چہرہ
ملول ہے)

شہنشاہ (ہار کو دیکھ کر) ارے ——— وہ ہار کیسا ہے۔

(رانی بھاگ کر ہار اٹھا لیتی ہے)

رانی :- میں جانوں یہ ہار شہزادہ والا اقتدار کا معلوم ہوتا ہے

بیگم :- دیکھوں ———

رانی! تم دیکھ کر کیا کرو گی ——— اُنہیں کا ہے۔

شہنشاہ :- شہزادے کا ہار یہاں کیونکر آ گیا۔

بیگم :- ہو سکتا ہے۔ شہزادہ صاحب یہاں آئے ہوں اور انہوں نے
استراحت فرمانے کی خاطر گلے سے ہار اتار کر ایک طرف رکھ
دیا ہو۔

شہنشاہ! ہو سکتا ہے!

رانی :- میرا خیال ہے شہزادہ ذی اقتدار سورج کی روشنی میں ہیروں کی
چمک کا نظارہ کر رہے ہونگے ——— اسی اثنا میں انہوں نے
ہار گھاس پر رکھ دیا ہوگا۔ اور پھر اٹھانا بھول گئے ہونگے ———
شاعر ہیں نا!

شہنشاہ :- ہو سکتا ہے۔

بیگم :- ایک اور بات بھی ہے جہاں پناہ! ممکن ہے کوئی کنیز چرا کر
لے آئی ہو۔

رانی :- ہرگز نہیں۔ یہ جہاں پناہ کی توہین ہے ——— کیا حضور عالی کی
کنیزیں چور ہو سکتی ہیں۔

شہنشاہ :- ہماری کوئی کنیز ایسی لغو حرکت نہیں کر سکتی!

بیگم :- حضور! (شرمندہ ہو کر) میں کیا کہہ سکتی ہوں!

شہنشاہ :- شہزادہ ہے کہاں؟

رانی :- صبح سیر کی غرض سے ادھر آئے تھے یہیں ہونگے۔ یا محل
میں جا چکے ہونگے۔

شہنشاہ :- آؤ رانی اسے تلاش کریں۔ بیگم تم اسے یہاں ڈھونڈو!

(رانی بیگم کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھتی ہے۔ اور
شہنشاہ کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بیگم وہیں کھڑی رہتی
ہے۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں ہیں
اسی اثنا میں لڑکی کنج گلاب سے باہر آ جاتی ہے)

بیگم :- کون ہے تو؟

لڑکی :- ایک لڑکی!

بیگم :- یہاں کیا کر رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ یہ باغ شاہی خاندان

کے افراد کی تفریح گاہ ہے۔

لڑکی :- جانتی ہوں۔

بیگم :- پھر یہاں آنے کی جرأت کیوں کی تم نے؟

لڑکی :- بس آگئی — پھول بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں نا۔

بیگم :- گستاخ! یہ باغ صرف ہمارے لئے ہے۔

لڑکی :- آپ کی طرح پھولوں کو دیکھنے ان کی رنگت سے لطف اٹھانے اور ان کی خوشبو سونگھنے کی مجھ میں بھی صلاحیت ہے۔

بیگم :- اگر شہنشاہ نے تمہیں دیکھ لیا تو —

لڑکی :- (الفاظ کاٹ کر) آپ مطمئن رہیں — آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بیگم :- بھاگ جاؤ یہاں سے!

لڑکی :- حضور خفا نہ ہوں چلی جاتی ہوں — جا رہی تھی۔ آپ کے مغموم چہرے کو دیکھا تو رک گئی؟

بیگم :- میرا چہرہ مغموم نہیں ہے۔

لڑکی :- میں مسرور اور مغموم چہروں میں تمیز کر سکتی ہوں بیگم صاحبہ۔

بیگم (آہ بھر کر) جھوٹ بول رہی ہو۔

لڑکی :- اب تو آپ نے آہ بھی بھری ہے — سینے میں جلتی ہوئی آگ سے دھواں باہر نکل آیا ہے۔

بیگم :- یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔

لڑکی :- کس قدر مظلوم زندگی ہے آپ کی۔ مغموم ہیں مگر اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بھی کوشش کر رہی ہیں۔

بیگم :- چپ گستاخ تمہیں گفتگو کرنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں!

لڑکی :- مجھے تصنّع نہیں آتا۔ آپ کی حالت دیکھ کر میرے دل کو دکھ ہوا میں نے سچی بات کہہ دی۔ اگر میں یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھتی۔ اور جھوٹ موٹ آپ کی تعریف کر دیتی۔ تو آپ خوش ہو کر مجھے ضرور انعام دیتیں۔ لیکن میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ کتنی دردناک زندگی ہے آپ کی۔ آپ کی ذاتی مسرت ہے اور نہ ذاتی دکھ شہنشاہ کی نگاہ التفات آپ کو مسرور کر سکتی ہے۔ اور شہنشاہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا غصے کا ایک لفظ آپ کی ساری مسرتوں کو جلا کر خاک کر سکتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو سنہری قفس میں بند کر رکھا ہے۔ جہاں آپ ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔ — لیکن قفس سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتیں!

بیگم :- (بے خیالی میں) آج مجھے رانی نے شکست دی ہے۔ شہنشاہ اسے چاہنے لگا ہے۔ وہ سارے دربار پہ چھا جائے گی۔ اس کے عزیز وزیر بن جائینگے۔ اور میں ایک کونے میں جا پڑونگی —

لڑکی :- یہ سمجھنا آپ کی کمزوری ہے۔

بیگم :- (سنبھل کر) خاموش — بدتمیز

لڑکی :- آپ نے اپنی ذات کو شہنشاہ کی شخصیت میں مدغم کر دیا ہے۔ آپ نے حقیقی مسرّت، محبّت، نفرت، ہر چیز کا احساس کھو دیا ہے۔ آپ ایک کٹ پتلی کی طرح شہنشاہ کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں — آپ شہنشاہ کی ایک ادنیٰ کنیز ہیں۔

بیگم :- خاموش! تمہارے لفظوں میں زہر بھرا ہے

لڑکی :- آپ کو میری باتیں زہریلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان باتوں کے آئینے میں آپ اپنی مجروح، اپاہج، لنگڑی لولی شخصیت کے خدوخال دیکھ رہی ہیں۔

بیگم :- تو پاگل ہو گئی ہے لڑکی

لڑکی :- آپ کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کس طرح شہنشاہ کی چہیتی بن جائیں — شہنشاہ آپ سے اس طرح دل بہلائیں۔ جس طرح کبوتر کے پر کاٹ کر اس سے دل خوش کیا جاتا ہے۔ ایک زنجیر پا کبوتر اور آپ میں کیا فرق ہے —؟ کبوتر کو موقع ملے تو وہ پھر سے اڑ جاتا ہے۔ لیکن آپ — آپ کو ان زنجیروں سے محبت ہے، جنہوں نے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ آپ کو اس قفس سے محبت ہے۔ جس میں آپ قید ہیں!

بیگم :- تو میری توہین کر رہی ہے — بدبخت!

لڑکی :- تو مجھے سزا دیجئے۔ مگر ایک قیدی آزاد انسان کو کیا سزا دے سکتا ہے۔

بیگم :- اب سمجھی تم تو چور ہو۔ لیکن ایسی باتوں سے تم اپنے جرم پر پردہ نہیں ڈال سکتیں!

لڑکی :- (مسکرا کر) اب آپ آپ کو ایک نیا فریب دینے لگی ہیں آپ؟

(رانی اور شہنشاہ آتے ہیں)

شہنشاہ :- بیگم! شہزادہ ادھر تو نہیں ہے۔

بیگم :- حضور! شہزادہ صاحب کو تو میں نے نہیں دیکھا۔ البتہ ہار کا چور پکڑ لیا ہے۔

شہنشاہ :- ہار کا چور۔ کون ہے۔

بیگم :- (لڑکی کی طرف اشارہ کرکے) جہاں پناہ یہ ہے۔

رانی :- جہاں پناہ! یہ محل کی کنیز نہیں ہے۔

شہنشاہ :- لڑکی! تو ہماری کنیز ہے؟

لڑکی :- خدا محفوظ رکھے۔

شہنشاہ :- (غصے سے) کیا مطلب؟

لڑکی :- میں کنیز نہیں ہوں اور نہ ہو سکتی ہوں!

رانی :- حضور! کس قدر بدتمیز اور گستاخ ہے۔ اسی وقت پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے اسے۔

شہنشاہ :- کون ہے تو لڑکی؟

لڑکی :- ایک لڑکی جو ایران سے آئی ہے ––– اور ایک سوداگر کی بیٹی ہے!

شہنشاہ :- مابدولت پوچھتے ہیں تو نے شہزادے کا ہار کیوں چرایا۔ تجھے معلوم ہے اس جرم کی سزا کیا ہے؟

لڑکی :- مجھے سزا معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے ہار چرایا ہی نہیں۔

بیگم :- حضور! یہی چور ہے۔ ہار چرا کر ادھر لا رہی تھی۔ ہم کو آتے دیکھا تو گھبراہٹ میں ہار پھینک کر کنج گلاب میں جا چھپی۔

شہنشاہ :- مابدولت سننا چاہتے ہیں کہ مجرم اس جرم کے متعلق کیا کہتا ہے۔ تو نے گستاخی کی ہے۔ مگر مابدولت انصاف کے ترازو کے کسی پلڑے کو بھی جھکنے نہیں دینگے۔ بول کیا کہتی ہے تو

لڑکی :- میں نے یہ ہار قطعاً نہیں چرایا۔

شہنشاہ :- حالات بہ بانگِ دہل تمہارے خلاف گواہی دے رہے ہیں! ––– تم مجرم ہو۔

لڑکی :- مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ میں نے ہار نہیں چرایا۔

رانی :- لڑکی! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ ظلِ الٰہی کی نگاہوں سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

لڑکی :- تو ظلِ الٰہی کو معلوم ہوگا کہ ہار یہاں کس طرح پہنچا۔

رانی :- جہاں پناہ! یہ تو کوئی گنوار لڑکی ہے۔

شہنشاہ :- (گرج کر) لڑکی! تجھے اصل معاملہ بتانا پڑے گا۔

لڑکی :- یہ ہار یہاں شہزادے نے پھینک دیا تھا۔

رانی :- بالکل جھوٹ جہاں پناہ شہزادہ والاتبار پر الزام لگانا چاہتی ہے۔

شہنشاہ :- کیا کہا شہزادے نے ہار پھینکا تھا۔

لڑکی :- جی ہاں!

شہنشاہ :- کیوں؟

لڑکی :- میں نے کہا تھا محبت صرف دو انسانوں میں ہو سکتی ہے شہزادے اور سوداگر کی بیٹی میں نہیں ہو سکتی۔ شہزادے نے ہار پھینک دیا۔ کیونکہ محبت نے انہیں انسان بنا دیا تھا!

رانی :- کتنی بے حیا لڑکی ہے۔

شہنشاہ :- لڑکی! یاد رکھ ہمارے غصے کی آگ کے آتشیں شعلے جسم کی دیواروں کو جلا کر راکھ کر دینگے۔ اور تو ان شعلوں میں خاکستر بن کر رہ جائے گی۔

لڑکی :- آپ سچی بات سننا پسند نہیں کرتے

شہنشاہ :- ہم سچی بات سننا چاہتے ہیں۔

لڑکی :- تو یقین کیجئے یہ بالکل سچی بات ہے۔

رانی :- جہاں پناہ! یہ بے حیا شہزادے پر خطرناک الزام لگا رہی ہے۔

(شہزادہ آتا ہے)

شہنشاہ :- شہزادے! یہ گستاخ چھوکری کیا کہہ رہی ہے۔

رانی :- میرے محترم شہزادے! یہ بدتمیز چھوکری آپ پر الزام لگا رہی ہے۔

لڑکی :- (مطمئن انداز میں) شہزادہ صاحب! اس وقت آپ کی آزمائش ہے۔ آپ نے کہا تھا۔ تم مجھے آزما سکتی ہو۔ آپ

محبت کے معاملے میں شہزادہ ہیں یا صرف انسان —

شہزادہ:۔ میں —

شہنشاہ:۔ شہزادہ! اپنا رتبہ پہچانو، ہم کہو

شہزادہ:۔ ہم — نے کہا تھا — ہم سمجھتے ہیں — میں — ہم — میں محبت میں انسان ہیں — میں۔

لڑکی:۔ سُن لیا آپ نے شہنشاہ!

رانی:۔ جہاں پناہ! یہ لڑکی کوئی جادوگرنی ہے۔ اس نے شہزادے پر جادو کر دیا ہے۔ شہزادہ کبھی ایسے بُرے لفظ زبان سے نہیں نکال سکتا

شہنشاہ:۔ کیا ما بدولت کی آنکھوں کے سامنے ہمارا لختِ جگر — ہماری امیدوں کا سہارا۔ لاکھوں انسانوں کے دلوں کا مالک ایسے الفاظ کہہ سکتا ہے — ہمیں ہمارے کان دھوکا تو نہیں دے رہے۔

لڑکی:۔ نہیں جناب!

رانی:۔ (ذرا آگے بڑھ کر) حضور! یہ لڑکی جادوگرنی ہے۔ یہ اس کے جادو کا اثر ہے کہ شہزادہ یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہے اسے مار ڈالنا چاہیئے۔ شہزادہ بالکل بے گناہ ہیں (لجاجت آمیز لہجہ میں، ہاتھ جوڑ کر) میں اپنی زندگی کے سب سے قیمتی آنسوؤں کو الفاظ کے دامن میں لیکر عرض کرتی ہوں کہ شہزادے کی گستاخی کو پدرانہ مراحم سے کام لیکر معاف کر دیں۔

شہنشاہ:۔ رانی! تیری آنسوؤں سے بھری آنکھوں نے ہمارے غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا دیا ہے۔ تیری مامتا ایک دیوار بن کر ہمارے اور ہمارے گستاخ شہزادے کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی — ہمیں رحم کرنا ہی ہوگا!

رانی:۔ عالم پناہ! کنیز لاکھ لاکھ شکریہ ادا کرتی ہے۔ کہ حضور نے اپنی باندی کے آنسوؤں کے دامن میں رحم کی بھیک ڈال دی

شہنشاہ:۔ ہمارے چاروں طرف زمین و آسمان گردش کر رہا ہے ہمیں تخلیئے کی ضرورت ہے۔ رانی ہمارے ساتھ چلو ہمیں تم سے مشورہ کرنا ہے

رانی:۔ جہاں پناہ! باندی کو اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے۔

شہنشاہ:۔ شہزادے تم بھی محل میں چلو — چلو

(شہزادہ قدم اٹھانے لگتا ہے)

لڑکی:۔ (بیگم سے) مجھے آپ سے گہری ہمدردی ہے اب بھی میدان رانی کے ہاتھ رہا — بدستور رانی شہنشاہ کی چہیتی ہیں آپ اب بھی شکست کھا گئیں باقی رہ گئی ہیں — میں (مسکرا کر) میں تو اسے صرف ایک کھیل سمجھتی تھی صرف ایک کھیل — شہزادے اور سوداگر کی بیٹی میں محبت — اوہ — ایک کھیل — صرف ایک کھیل۔

(لڑکی تیزی سے چلی جاتی ہے۔ شہنشاہ رانی کے ساتھ قدم اٹھانے لگتا ہے۔ بیگم تنہا رہ جاتی ہے۔ وہ بھی آہ بھر کر آہستہ آہستہ جا رہی ہے) (پردہ)

امن زندہ رہے گا!

"تمام دنیا کی امن پسند طاقتو! متحد ہو جاؤ
اپنے مستحکم اتحاد اور مسلسل جدوجہد سے
جنگ کا خاتمہ کر دو۔
عوامی جمہوریت کی فتح زندہ باد!"

(چینی نمائندہ)

۲۰ اپریل سنہ ۱۹۴۹ء کو پیرس میں عالمگیر امن کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں تقریباً ۱۷۸۴ مندوب شریک ہوئے۔ جن کو بے شمار امن پسند ممالک کی انجمنوں اور لاکھوں افراد کی مخلصانہ نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ ہال کی دیواروں پر تمام ملکوں کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے اور جابجا مختلف زبانوں میں بڑے بڑے پوسٹر آویزاں تھے جن میں اس قسم کی تحریریں امن پسند عوام کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

"امن کی حفاظت کرنا تمام قوتوں کا فرض ہے"

"امن کیلئے متحد ہونا ہمارا مقدس فریضہ ہے"

اس کانفرنس میں جو مندوب شریک ہوئے ان میں فریڈرک جولیو کیوری، لوئی آراگون (فرانسیسی مصنف)، مارٹن اینڈرسن نکسو (ڈنمارک کا مصنف)، پروفیسر جے، ڈی، برنل (برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر) مادام یوجینی کاٹن (عورتوں کی بین الاقوامی جمہوری جماعت کی صدر) الیگزینڈر فیڈلیف (روسی مصنف) وینڈا دلیسی بیوسکا (وی ریور) کی شہرۂ آفاق مصنفہ) الیا اہرن برگ (روس کا مشہور مصنف) پروفیسر کوموجو (چینی تاریخ دان)، جوز گیرال (سابق سپینی وزیراعظم)

ان ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے:۔

فرانس، امریکہ، برطانیہ عظمیٰ، سوویٹ روس، چین، اٹلی، افریقہ، البانیہ، جرمنی، ارجنٹائن، آسٹریلیا، بلجیم، برازیل، بلگیریا، کینیڈا، چلی، کوریا، کیوبا، ڈنمارک، سپین، فنلینڈ، یونان، ہنگری، ہالینڈ، ہندستان، انڈونیشیا، عراق، ایران، آئرستان، لبنان، لکسمبرگ، مڈغاسکر، میکسیکو، منگولیا، ناروے، پولینڈ، رومانیا، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلوویکیہ، ٹرانسوال، ٹرائسٹ، طرابلس، ویٹ نام، یوگوسلاویہ

ایوب احمد کرمانی

۵ اپریل کو واشنگٹن کی ایک سر بفلک عمارت کے آراستہ و پیراستہ کمرے میں مغربی یورپ کی بارہ حکومتوں کے نمائندے اکٹھا ہوئے تھے۔ وہ پہلے اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھ گئے، پھر یکے بعد دیگرے اُٹھے اور لائن لگا کر ایک دستاویز پر دستخط کرنے لگے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین ایچیسن (Acheson) کی باری سب سے آخر میں آئی، موصوف نے دستخط کئے اور دستاویز اپنی تجوری میں مقفل کر دی۔ چشم زدن میں دنیا کی بیشتر نشر گاہوں سے اٹلانٹک پیکٹ کی دفعات کا اعلان ہونے لگا۔ امریکی وزیر خارجہ نے دنیا کو مژدہ سنایا کہ

"اگر جرمنی کے روسی علاقے پر ہمارے طیاروں نے پرواز کی اور روسی ہوائیہ نے کوئی مداخلت کی تو یورپ کی بارہ حکومتیں اعلان جنگ کر سکتی ہیں"

مسٹر بیون نے فرمایا:-

"اب کامن ویلتھ کے ممالک کا دفاع بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ اٹلانٹک پیکٹ سے کامن ویلتھی ملکوں کا بھی بالواسطہ تعلق ہے"۔

مسٹر چرچل نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب "مغربی جمہوریت" محفوظ ہو گئی، یورپ کے جس "اتحاد" کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ امریکہ کی زیر قیادت حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

اسپین کے فرینکو، جنوبی افریقہ کے مالن اور اسمٹس فرانس کے دی گال اور شومین، جرمنی کے شاخت، پرتگال کے سالازار، سب نے بڑی گرمجوشی سے اس معاہدہ کا خیر مقدم کیا، معاہدہ نام کو تو "اٹلانٹک پیکٹ" تھا در اصل یہ جغرافیائی قیود سے بالکل آزاد تھا۔ چین کے مارشل چیانگ، جاپان کے وزیر اعظم، ویت نام کے دباؤ دائی، انڈونیشیا کے ولندیزی گورنر اور یہ لگے تھاکن نو سب نے اس سے اسی قدر تعلق خاطر ظاہر کیا۔ جیسا کہ خود ادھر ساحل اٹلانٹک کے حکمرانوں بیون اور ایچیسن نے بے چارے سب "مغربی جمہوریت" کو محفوظ رکھنے کے لئے بے قرار ہیں۔ مغرب سے لیکر مشرق تک "مغربی جمہوریت" کے وکیلوں کا خاندان پھیلا ہوا ہے، وہ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے مسائل سے دو چار ہیں۔ پھر بھلا ایک ہی طرح عمل اور اظہار خیال کیوں نہ کریں ——؟

آج سے کوئی چودہ پندرہ سال قبل بھی "مغربی تہذیب" کے علمبردار اکٹھا ہوئے تھے، اُنھوں نے بھی "اینٹی کمنٹرن پیکٹ" (Anti Commintern pact) نام کے ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے، جرمنی سے لیکر جاپان تک ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی کی زیر قیادت "کلچر" کے محافظوں کا ایک محاذ منظم ہوا تھا، لیکن وہ بے چارے اپنی کوششوں کے باوجود ناکام ہوئے، اب یہ نامکمل کام ان کے رفقا نے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا ہے، ان رفقا کو دعویٰ ہے کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے اور ہٹلر اور مسولینی جو کچھ نہیں کر سکے، ہم کر دکھائیں گے ——!

وال اسٹریٹ کے اجارہ دار، اسلحہ ساز کارخانوں کے مالک بڑے بڑے کثیر الاشاعت اخبار، ریڈیو اسٹیشن، فلم کمپنیاں، نشر و اشاعت

کے سارے ذرائع۔ مغربی تہذیب " کے "جہاد" کے لئے از سرِ نو مجتمع کئے جا رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، "تہذیب" کی حفاظت اور "امن" کی بحالی کے لئے طاعون، ہیضے اور گردن توڑ بخار کے جراثیم پالے جا رہے ہیں، بعض اہلِ قلم اپنی مصوری اور منظر کشی کی صلاحیت یہ واضح کرنے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں کہ ایک ایٹم بم دنیا کی ہزاروں آبادیوں کی صورت کو کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ زہریلی گیس کی ہلاکت آفرینیاں کیسی ہیں اور ان سب کا استعمال کیوں ضروری ہے — !

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بے چارے ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی سے زیادہ بدقسمت ہیں۔ ان لوگوں نے کم از کم اپنے منصوبے بڑی آسانی سے بنائے تھے اور اپنی "تہذیب" کو نافذ کرنے کے لئے ہاتھ پیر بھی مارنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اینٹی کمنٹرن پیکٹ کے بعد دنیا دم بخود اور ساکت ہو گئی تھی، کسی طرف سے موثر مخالفت نہیں ہوئی، چند تہذیب کے "دشمنوں" نے دو ایک جگہ آوازیں اٹھائیں۔ لیکن "مغربی دنیا" نے ان پر کان نہیں دھرا، اسپین میں فرینکو صاحب نے "مغربی تہذیب" نافذ کر دی، دوسری جنگ چھڑ گئی، یہ اور بات ہے کہ اس جنگ میں ناکامی ہوئی۔ ورنہ ہٹلر صاحب کامیابی کے دروازے تک پہنچ کر لوٹ آئے!

"اطلانتک پیکٹ" کے بعد تو دنیا بھر میں تہذیب کے ان علمبرداروں کے خلاف عوام کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ واشنگٹن میں صرف بارہ حکومتوں کے نمائندے جمع ہوئے تھے، پیرس میں ۷۲ قوموں کے نمائندے اکٹھا ہوئے، واشنگٹن میں جمع ہونے والے نمائندے سفید عمارت سے نکل کر منہ چھپا کر بھاگے۔ پیرس کے نمائندوں کا لاکھوں عوام نے خیر مقدم کیا، دنیا کے کونے کونے سے آوازیں بلند ہوئیں، اب سنہ ۳۵ء والی غلطی نہیں دہرائی جائیگی، اب جنگ نہیں ہو گی۔ فرانس کو اطلانتک پیکٹ میں شامل تصور کیا گیا۔ لیکن فرانس کے لاکھوں منظم مزدوروں، کروڑوں عوام اور ممتاز اہلِ علم، اہلِ فن، سائنسدانوں اور فنکاروں نے اعلان کیا کہ ہم اطلانتک پیکٹ کے پابند نہیں، برطانیہ کی کوئلے کی کانوں کے محنت کشوں نے مسٹر بیون کو پیغام بھیجا۔ آپ "دفاع" کی جتنی جی چاہے باتیں کیجئے، لیکن اگر آپ نے جنگ چھیڑنے کی کوشش کی تو آپ کو کوئلہ نہیں ملے گا۔ برطانوی کلیسا کے سب سے بڑے اسقف نے اعلان کیا کہ یہ امن کے نام پر جنگ کی تیاریاں نہیں، تہذیب کے نام پر بہیمیت کے منصوبے ہیں، برطانوی اہلِ علم بیون اور اٹیلی کے ساتھ نہیں ہیں — سائنسدان شیلڈن اور ہالڈین نے لیبر پارٹی کو آگاہ کر دیا کہ برطانوی سائنسدان اپنی صلاحیتوں کو تخریب کے لئے استعمال نہ ہونے دیں گے۔

اٹلی میں ہر دیہات، ہر قصبے اور ہر شہر میں اطلانتک پیکٹ کے خلاف اور امن کی حمایت میں جلسے ہوئے۔ اطالوی پارلیمنٹ میں اطالوی عوام کے ترجمان پیترو ننی نے صاف صاف کہہ دیا اطالیہ اب فاشزم کا شکار نہیں ہو گا، ہم کسی استعماری جنگ میں نہیں لڑیں گے۔ ہم جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کا منہ بند کر دیں گے، اور خود امریکہ میں یونیورسٹیوں کے معلم، کلیساؤں کے راہب، ہالی ووڈ کے فنکار، ادبی انجمنوں کے ترجمان، ایک زبان ہو کر چلا اٹھے " یہ اطلانتک پیکٹ" نہیں ہے یہ تیسری جنگ کا پیش خیمہ ہے، امریکہ جرمنی کی جگہ لینا چاہتا ہے، امریکی تاجر ایٹم بم کے سہارے ساری دنیا کو مسخر کرنا چاہتے ہیں، امریکی عوام ان جنگ پرستوں کے ساتھ نہیں ہیں" مختصر یہ کہ دنیا کے طول اور عرض میں امن، امن، امن کی صدائیں گونج اٹھیں،

جبابرہ وزراءِ خارجہ ۵ اپریل کو اطلانتک پیکٹ پر دستخط کر کے اطمینان سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب دنیا مشرق و مغرب میں تقسیم ہو گئی، اس طوفان کو دیکھ کر بوکھلا گئے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دنیا کی جو حد بندی انہوں نے کی ہے وہ مصنوعی اور بے بنیاد ہے، دنیا کچھ اور ہی انداز میں تقسیم ہے۔ تقسیم کی لکیر مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کے درمیان نہیں۔ بلکہ یہ تو فرانس، برطانیہ اور خود امریکہ کے قلب سے گزرتی ہے، دنیا امن، تہذیب، سلامتی، اچھی زندگی، تعمیر اور ترقی کے حامیوں اور منافع خوروں، اسلحہ سازوں، جنگ بازوں اور ڈالر کے پجاریوں کے مابین تقسیم ہے۔ ایک طرف زندگی کی طاقتیں ہیں جو نسلی تقسیم، جغرافیائی قیود اور قومی عصبیت سے بالاتر محض انسانی قدروں کی بنیاد پر منظم ہیں، دوسری طرف ہلاکت، قحط، بھوک فاقے اور وباؤں کے وکیل ہیں، یہ بھی بھانت بھانت کی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا بھی مختلف ملکوں اور مختلف قوموں سے تعلق ہے لیکن یہ بین الاقوامی اتحاد نہیں۔ بلکہ لٹیروں کا گٹھ جوڑ اور ڈاکوؤں کا میل ہے۔ ان کے ساتھ کوئی قوم نہیں جن کے اتحاد کو بین الاقوامی "اتحاد"

کہا جا سکے! دنیا اس تقسیم کو سمجھتی ہے۔ خود اطلانٹک پیکٹ والے اس سے واقف ہیں۔ مگر بے چارے کیا کریں۔ ان کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ سوائے طبعی موت یا خودکشی کے!

اطلانتک پیکٹ کے ایک حامی چیانگ کائی شیک صاحب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ دوسرے باؤدائی صاحب کا عنقریب ہونے والا ہے۔ انڈونیشیا کی زمین ولندیزوں کے پیروں تلے سے سرکتی جا رہی ہے۔ برما میں کافی زمین سرک چکی ہے۔ کوریا ہاتھ سے نکل رہا ہے، جاپان کے نکلنے کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ مغربی جرمنی سے فوجیں ہٹا کر بلایا، ہانگ کانگ یا کوریا بھیجتے ہیں تو فرانس میں انقلاب کا خطرہ ہے۔ اگر نہیں بھیجتے ہیں تو مشرق ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اگر وہ یونان سے فوجیں ہٹاتے ہیں تو اٹلی کی خیر نظر نہیں آتی، اگر نہیں ہٹاتے ہیں تو اٹلی جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر کم بخت معاشی بحران نے بھی آن دبوچا ہے۔ کل فرینک کی قیمت گر گئی، آج اسٹرلنگ کی باری ہے۔ کل پھر ڈالر کی باری بھی آ جائے گی۔ جنگ ہوتی تو شاید یہ بحران نہ آتے، لیکن جنگ کیسے ہو۔ امن کی طاقتیں جو سر پر مسلط ہیں۔

کامن ویلتھ:۔ مسٹر بیون نے بڑی آسانی کے ساتھ فرما دیا تھا کہ کامن ویلتھی ممالک بھی بالواسطہ اطلانتک پیکٹ کے حامی ہیں غالباً کامن ویلتھ سے ان کی مراد وہ تاجر اور وہ مالکانِ کارخانہ تھے جو ۲ فیصدی یا ۳ فیصدی کمیشن کے معاوضے میں اپنے ملکوں کو مکمل آزادی سے محروم اور مستعمراتی درجہ پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسلئے کہ کامن ویلتھ کے کسی ملک کے عوام خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، اب ڈالر کی جنگ کا ایندھن بننے کے لئے آمادہ نہیں۔ آج آسٹریلیا کی گودیوں اور بمبئی و کراچی کی بندرگاہوں کے مزدور ایک ہی طرح سوچتے ہیں، اسلئے کہ وہ ایک ہی طرح استعماری جنگوں کا ایندھن بنائے جا چکے ہیں۔ جب اطلانتک پیکٹ کی حلیف ولندیزی حکومت کے جہاز انڈونیشیا کی آزادی کو کچلنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ تو آسٹریلیا، ہندوستان اور پاکستان کے مزدور بے ساختہ ان جہازوں کے لئے اپنی بندرگاہوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ جب مغربی افریقہ میں نسلی تفوق کا مظاہرہ ہوتا ہے تو کامن ویلتھ کی وزرائے اعظم کانفرنس اس پر خاموش ہوتی ہے۔ لیکن کامن ویلتھ کے عوام اس پر بے ساختہ پھٹکار بھیجتے ہیں، مسٹر بیون اپنی جگہ جس کو چاہیں۔ اطلانتک پیکٹ کا حامی تصور کریں، لیکن یہ حقیقت بہرحال حقیقت ہے کہ تاجِ برطانیہ کے تحت کامن ویلتھ کا مصنوعی گٹھ جوڑ چند ہی دنوں کا مہمان ہے خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے عوام نے تو اُن مقاصد کو حاصل کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ جن کے لئے صدیوں سے انکی بے شمار نسلیں بے پناہ قربانیاں دیتی آئی ہیں

پاکستان کے باشندے بنگال کے قحط کو کیوں کر بھول سکتے ہیں۔ وہ کیسے فراموش کر دینگے کہ جنگ کے معنی ان کے لئے بھوک فاقے اور موت کے سوا کچھ نہیں بنگال کے ۳۵ لاکھ شہیدوں کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اُن زخموں کی ٹیک اب تک محسوس کر رہی ہیں۔ اس ملک کے کروڑوں عوام جانتے ہیں کہ کس طرح "جمہوریت" اور "تہذیب" کے نام پر ان کے مغربی آقا انہیں استعماری جنگوں کا ایندھن بناتے آئے ہیں۔ ان کی فصلوں کو دن دیہاڑے لوٹتے رہے ہیں۔ ان کی روزیاں چھینتے رہے ہیں۔ انہیں دلاسے دے دے کر موت کی نیند سلاتے آئے ہیں۔ پنجاب کا کوئی دیہات ایسا نہیں جس کا کوئی نہ کوئی کڑیل جوان، ایمری اور چرچل کی جوع الارض کی بھینٹ نہ چڑھا ہو۔ دوسری جنگ کا افراطِ زر، مہنگائی اور معاشی بحران ابھی تک پاکستانی عوام کی زندگی حرام کئے ہوئے ہے۔ اب وہ چرچل اور ایمری کے جانشینوں، اٹلی اور بیون کے ہتھکنڈے خوب سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ یہ سب کس کے "دفاع" کی تیاریاں ہیں اور کس "تہذیب" کی حفاظت کے لئے دہائی دی جا رہی ہے۔

جس استعمار نے تہذیب کو ملیامیٹ کیا ہو۔ جس کے دور میں علم غیباً اور جہالت آباد ہوئی ہو، جس کے سایہ تلے وبائیں منڈلاتی ہوئی گھومتی ہوں، جس کے وجود سے جلیانوالہ باغ۔ قصہ خوانی بازار جیسی ہزاروں خونچکاں داستانیں وابستہ ہوں، اس کے منہ سے "تہذیب" کا نام سُن کر اس ملک کے عوام فریب میں نہیں آ سکتے۔ البتہ چونکے ضرور ہو سکتے ہیں یہ کامن ویلتھ ہی کے سایہ کی برکت ہے کہ آج بھی پاکستان کی قومی آمدنی کا ۶۰ فیصد حصّہ فوجی اغراض کیلئے مختص ہے۔ وہ بیماریاں جو اٹلی اور بیون کے بیشروں کی مرہونِ منت ہیں آج بھی ہمارے عوام کا کلیجہ کھائے جا رہی ہیں، وہ بھلا لیڈروں کو اپنا امین اور رہزنوں کو اپنا رہبر کیوں کر سمجھیں؟ اور پھر جس "مشرقی خطرے" کے خلاف مسٹر بیون "مغربی" محاذ بنا رہے ہیں، وہ ہمارے لئے کیوں کر "خطرہ" ہے اس

ملک کے ادیبوں نے ٹالسٹائی، دستاوسکی، چیخوف اور گورکی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہمارے سارے نئے ادب میں سوویٹ روس کے عظیم فنکاروں کی جھلک ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کے اثر سے شروع ہوئی تھی۔ علم و فضل کی لہریں، یونان و روم سے سپین فرانس اور انگلستان پہنچیں، مغرب نے مشرق سے سیکھا۔ علم و ادب میں اضافے کیلئے اب مشرق مغرب سے سیکھ رہا ہے، خواہ وہ برنارڈ شا کی ادبی تخلیقات ہوں، یا کیوری اور آئن سٹائن کی سائنسی ایجادات، خواہ وہ انقلابِ فرانس ہو یا انقلابِ روس، ہندوستان اور پاکستان بلا امتیاز ان سے متاثر ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مسٹر بیون اور مسٹر ایٹلی اگر اس ذہنی تبدیلی — کو اٹلانٹک پیکٹ، اور ایٹم بم کے ذریعہ روکنا چاہتے ہیں تو محض ان کی خواہش سے تاریخی تقاضے نہیں رُک جائینگے۔ ہمیں علم ہے کہ کس طرح زارشاہی کے استبداد کے خاتمہ کے بعد وسط ایشیا کے مسلم علاقوں کا ایک نیا اور درخشاں دور شروع ہوا، نئی تہذیب اور علم کی کیوں کر آبیاری ہوئی۔ قومیتوں کا مسئلہ کیوں کر سلجھایا گیا، بھوک فاقے اور بے روزگاری کو کیوں کر دور کیا گیا، اور ہم اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام لندن کے قمار بازوں، دولت کے پجاریوں، بردہ فروشوں اور رقاصائیوں کے پابند نہیں ہیں، اب انہوں نے پابندیوں اور حدبندیوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دینے کی ٹھان لی ہے، اب انہیں بلا امتیاز ساری دنیا کے تہذیبی اور انسانی ورثوں سے استفادہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا — !

عالمگیر برادری، اخوت اور بھائی چارے کا جو سیلاب آج جنگ پرستوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے، پاکستان کے اہلِ ثروت اس سے علیحدہ نہیں، وہ اپنے کمیشنوں کے لئے ڈالر اور سٹرلنگ کے مندروں میں پیشانیاں رگڑ رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کے عوام اہلِ فکر اور اہلِ دانش ان ۷۲ قوموں کے ساتھ ہیں۔ جنہوں نے پیرس میں انسانیت کا بول بالا کرنے اور جنگ پرستوں پر امن نافذ کرنے کا عہد کیا ہے۔ قول سے نہیں بلکہ عمل سے !

بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہندوستان، برما، ملایا اور مشرق بعید کے دیگر ممالک کے عوام برسرِ عمل ہیں —— ؟
تیسری جنگ چھڑنے سے پہلے جنگ کے شعلے بھڑکانے والے خود مفلوج ہو چکے ہونگے۔ یہ سنہ ۱۹۳۹ء نہیں ہے سنہ ۱۹۴۹ء ہے — !

٭ ٭ ٭ ٭

"ستم یہ ہے کہ نئے جنگ آزماؤں نے جنگی پروپیگنڈا کے لئے مدرسے، معابد، سینما گھر، ریڈیو اور ادب تک کو استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے اور نئی جنگ کو بالکل اسی طرح قومی امتیاز قرار دیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۳۹ء سے پہلے جرمنی میں ہوا تھا
ان حالات میں ہمارا فرض ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے پہلے سے بھی زیادہ متحد ہو جائیں۔ ہمیں مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اقوام متحدہ
نے جنگ پسندوں کی خدمت میں جو قرارداد ابتدا میں پاس کی تھی۔ اس پر عمل کیا جائے۔ ہمیں مطالبہ کرنا چاہیئے
کہ ہتھیاروں میں کمی کر دی جائے۔ ایٹمی قوتوں پر بین الاقوامی کنٹرول قائم ہو اور یالٹا اور پوٹسڈم
کے فیصلوں کے مطابق تمام مسائل نئے سرے سے حل کئے جائیں ہمیں
مطالبہ کرنا چاہیئے کہ امریکہ اور برطانیہ دوسرے ملکوں کے
اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی
بُری عادت چھوڑ دیں

عبداللہ ملک

پیرس امن کانفرنس

فرانس کے ایک مشہور محبِ وطن سیاستدان جوریز نے کہا تھا۔

"سرمایہ داری اپنے بطن میں جنگ کو اس طرح سے چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے بادل بجلی کو اپنے اندر"

فرانس کے اس زندہ جاوید محبِ وطن کا مقولہ جتنا آج صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا، ابھی جنگ کو ختم ہوئے چار برس بھی نہیں گزرے کہ دنیا کے عوام ایک نئی جنگ کے خوف سے لرزاں و ترساں ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں، دنیا کے سرمایہ دار ممالک کے میزانئے جنگ اور دفاع کے میزانئے بن رہے ہیں، فوجوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کارخانوں میں ٹریکٹروں کی بجائے توپیں اور مشین گنیں ڈھل رہی ہیں۔ لوگوں کو غذا مہیا نہیں ہو رہی۔ بلکہ زہریلی گیسیں تیار ہو رہی ہیں، اور یہ عالمِ رنگ و بو پھر ایک بار موت و ہلاکت کے دہانے پر کھڑا ہے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے میونخ کا معاہدہ وجود میں آیا تھا۔ اس وقت یہ معاہدہ موت اور ہلاکت کا معاہدہ تھا۔ اور آج پھر نئی جنگ کے لئے عہد و پیمان ہو رہے ہیں، مغربی یورپ کی یونین وجود میں آ رہی ہے، مغربی یورپ کے ممالک آپس میں جنگی اور فوجی معاہدے کر رہے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر معاہدۂ اوقیانوس وجود میں آ رہا ہے، آخر یہ جنگ کیوں؟ صرف اس لئے کہ امریکہ کے سرمایہ دار اپنی منفعت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، انہیں پھلوں اور گوشت سے زیادہ اسلحہ سے منافع حاصل ہونا چاہئے، اس لئے امریکہ کے کارخانہ دار پھلوں گوشت اور پنیر کی بجائے اسلحہ تیار کر رہے ہیں۔ اور ان ہتھیاروں کو بیچنے کے لئے اور دنیا کو اپنی منڈی بنانے کے لئے وہ جنگ چاہتے ہیں، تاکہ ایک طرف دنیا بھر کی جمہوری تحریکوں کو کچل سکیں۔ اور دوسری طرف دنیا کو اپنی غلامی کی سنہری زنجیروں میں جکڑ سکیں، چنانچہ معاہدۂ اوقیانوس کے ذریعے یہ سنہری زنجیریں تیار کی گئی ہیں، چنانچہ امریکی پروگریسو پارٹی کے لیڈر ہنری ویلس نے اس معاہدے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا،

اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک کے سیاستدان بار بار امن کی دہائی دے رہے ہیں، لیکن یہ معاہدہ تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ جو دنیا کے عوام کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دے گا۔ اقوامِ متحدہ کے بنیادی منشور کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کرنے سے یہ حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی۔ کہ اس معاہدے کا مقصد اقوامِ متحدہ کی انجمن کو ختم کرنا ہے۔ اس معاہدے کی خصوصیت کو ثابت کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ یہ محض علاقائی معاہدہ ہے۔ اس لئے بالکل بے ضرر ہے۔ لیکن شاید یہ "علاقہ" کی تشریح ہٹلری سیاست دانوں کی طرح کی جا رہی ہے۔ جو تمام دنیا کو اپنا علاقہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ اپریل کے مہینے میں ہی واشنگٹن میں بارہ ممالک نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے، یہ دستخط تھے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی موت کے پروانے پر، یہ دستخط تھے جنگ کے اعلان نامے پر، یہ دستخط تھے۔ دنیا بھر کی جمہوری تحریکوں کی تباہی کے خاتمہ پر، لیکن آج دنیا کے کروڑوں انسانوں

کو جنگ کی یادیں بھولی نہیں ہیں، انہیں موت اور ہلاکت کی داستانیں ابھی تک پوری طرح یاد ہیں، ان بیواؤں کو اپنے ماتھے کا سندور ابھی تک یاد ہے۔ جن کے شوہر یورپ، ایشیا اور افریقہ کے میدانوں میں نازیوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے، اب یورپ کو، ایشیا کو، افریقہ کو اس دنیا کے کروڑہا انسانوں کو پھر سے جنگ کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے، لیکن آج وہ اس موت اور ہلاکت کی بھٹی میں جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ امن چاہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے زخم مندمل کر سکیں، وہ امن چاہتے ہیں، تاکہ وہ ان خوبصورت شہروں کو پھر سے تعمیر کر سکیں۔ جنگو نازی بموں نے تہس نہس کر دیا ہے۔

اسی لئے جب واشنگٹن میں بارہ ممالک کے مٹھی بھر حکمران عوام کو جنگ، موت اور ہلاکت کے سمندر میں غرقاب کرنے کے لئے سفارش کر رہے تھے۔ تو عین اسی وقت پیرس میں امن کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، یہ کانفرنس اسی پیرس میں ہو رہی تھی جس کے بیچوں بیچ دریائے سین گزرتا ہے۔ یہ وہی پیرس ہے جسے فرانس والے شہروں کی ملکہ کہتے ہیں، جس میں نوترے ایم کا گرجا ہے اور یونانی دیوی دیوتاؤں کے مجسمے ہیں، یہ وہی پیرس ہے جس کے گلی کوچوں میں اخوت و مساوات کے نعرے گونجے تھے، انہی گلی کوچوں نے دنیائے علم و ادب کو روسیو، والتیر، وکٹر ہیوگو، فلابیئر اور بالزک دیا تھا۔ یہ وہی پیرس ہے جہاں سے پہلی بار مزدور انقلاب کا نعرہ بلند ہوا تھا، یہ وہی پیرس ہے، جہاں کے مزدوروں نے بیرونی حملہ آوروں اور اپنے سرمایہ داروں کے خلاف پہلی بار ہتھیار اٹھائے تھے، آج پھر اسی پیرس میں اس شہروں کی ملکہ کے گلی کوچوں میں، اسی یونانی دیوی دیوتاؤں کے مجسموں والے شہر میں، انسان نعرے بلند کر رہے تھے کہ

"ہم جنگ نہیں چاہتے۔ ہم امن کے خواہاں ہیں، ہم اگر نازیوں کو شکست دے سکتے ہیں تو امریکہ و برطانیہ کے جنگ کے حامیوں کو بھی ہرا سکتے ہیں"

پیرس کانفرنس

۲۰ سے ۲۵ اپریل تک پیرس کے گلی کوچوں میں، ریسٹورانوں اور ہوٹلوں میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، لائبریریوں اور لیباریٹریوں میں امن کے چرچے ہوتے رہے، پیرس نے ۱۴ برس پہلے بھی ایک امن کانفرنس دیکھی تھی، اس وقت صرف یورپ کے دانشور اور اہل قلم اس شہر میں جمع ہوئے تھے، انہوں نے نہایت نحیف و نزار آواز میں دنیا کے دانشوروں کو مخاطب کیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا موت کے بادل امڈ رہے ہیں۔ اور زندگی کی ننھی ننھی کونپلوں کے ختم کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس لئے اٹھو اور موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کرو" لیکن اس آواز پر بہت کم لوگوں نے کان دھرا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا چھ برس تک موت کی دہلیز پر دم توڑتی رہی۔ لیکن آج اس کانفرنس میں امن چاہنے والوں، جنگ کے مخالفوں کی آواز نحیف و نزار نہیں تھی، اس آواز میں خود اعتمادی تھی، اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ اور عزم تھا چنانچہ اسی لئے جب پیرس کے پیرل ہال میں کانفرنس شروع ہوئی تو فرانس کے مشہور سائنسدان جیولیو کیوری نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے زوردار الفاظ میں کہا۔

"ہمیں اپنی مشکلات کا پوری طرح احساس ہے، لیکن یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ عام انسان امن کی جنگ شروع کر رہا ہے، ہم نے اس سے پہلے بھی جنگ کے خلاف لڑائیاں لڑی ہیں اور آج بھی اس امن کی لڑائی میں ہم پورے عزم اور یقین کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں اپنی فتح کا پورا یقین ہے، ہمیں اپنی طاقت کا اچھی طرح علم ہے اس لئے ہم صرف اس لڑائی میں جنگ چاہنے والوں کے کارناموں کی مذمت ہی نہیں کریں گے،

ہم یہاں پر جنگ کے پجاریوں سے امن کی بھیک مانگنے اکٹھے نہیں ہوئے۔ بلکہ ہم امن کو ان پر مسلط کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔"

اس کانفرنس میں دنیا کے کونے کونے سے مختلف سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی اداروں نے شرکت کی۔ چنانچہ امن کانفرنس باضابطہ طور پر ۶۰ کروڑ انسانوں کی نمائندگی کر رہی تھی، اس کے باوجود بہت سے ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے ہاں کے نمائندوں کو اس امن کانفرنس میں شریک ہونے سے روک دیا، چنانچہ پنڈت جواہرلال نہرو کی حکومت نے ایک نمائندے سردار جعفری کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا، دوسرے نمائندے ملک راج انند سے پاسپورٹ چھین لیا۔ تیسرے نمائندے کرشن چندر کو پاسپورٹ دینے ہی سے انکار کر دیا، اسی طرح کئی اور ملکوں کے حاکموں نے امن کانفرنس کے نام سے ناک بھوں چڑھائے۔ چنانچہ خود فرانس کی حکومت نے اعلان کر دیا۔ کہ کسی ملک سے بھی ۸ سے زیادہ نمائندے شریک نہیں ہو سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مندوبین کو فرانس کی سرحدوں پر ہی رک جانا پڑا، بالآخر پیرس کانفرنس کے دوش بدوش پراگ میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں باقی مندوبین نے حصہ لیا۔

پیرس کے اس حسین و جمیل شہر میں ۷۲ ملکوں کے نمائندے جمع ہوئے۔ اور چودہ کے قریب بین الاقوامی اداروں نے اس کانفرنس کے ساتھ اپنے کو ملحق کیا اور اس کانفرنس کی دعوت دینے والوں میں شریک ہوئے، چنانچہ ان میں عالمگیر ٹریڈ یونین فیڈریشن تھی، اسکے ممبروں کی تعداد سات کروڑ تھی، نوجوانان عالم کی جماعت تھی۔ جس کی تعداد ۵ کروڑ بیس لاکھ تھی، سیاسی قیدیوں کا ادارہ بھی اس میں شامل تھا اس کی تعداد ایک کروڑ تھی، ۳۰ لاکھ طلباء اور ۲۰ لاکھ اساتذہ کی جماعتیں بھی داعیان میں شریک تھیں

وراشلوڈ سے پیرس تک

گئے سال بھی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، یہ کانفرنس پولینڈ کے ایک شہر وراشلوڈ میں منعقد ہوئی تھی، اس شہر میں امن کے حامی جمع ہوئے تھے انہوں نے بھی جنگ چاہنے والوں کی مذمت کی تھی، لیکن اس کانفرنس میں ادیب، صحافی، سائنس دان اور دانشور جمع ہوئے تھے، انہوں نے امن کی لڑائی کے تمام گوشوں پر نگاہ نہیں ڈالی تھی، انہوں نے اس عظیم لڑائی کے لئے کوئی ادارہ بھی قائم نہیں کیا تھا، ان تمام خامیوں کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔ کہ یہ کانفرنس امن کی اپیل تو کر سکی۔ لیکن امن کے لئے عوام کو منظم کر کے جدوجہد کی راہ پر چلنے میں ناکام رہی۔

پیرس کانفرنس نے وراشلوڈ کی تمام خامیوں کو دور کر دیا، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پیرس میں تمام اضلاع اور دیہات سے لکھوکھا انسان اس کانفرنس اور اسکے مندوبین کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق پہنچے، عام انسانوں کی دلچسپی کے بارے میں طاس کے نامہ نگار نے بہت خوبصورتی سے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے،

صبح تڑکے ہی سے پیرس کے گوشے گوشے سے لوگ پورٹ وارمان کی طرف چل پڑے تھے یہیں پر بفیلو سٹیڈیم واقع ہے، پیرس کے بسنے والے اور فرانس کے دوسرے شہروں سے امن کے پجاری تانتا باندھے اسی جگہ چلے آرہے تھے۔

پچھلے چند ہفتوں سے فرانسیسی اس دن کی ایسے تیاریاں کر رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا تیوہار منایا جانے والا ہے۔

امن کے پجاری شہر شہر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں سے ہوتے ہوئے آرہے تھے۔ کوئی موٹر اور لاری پر تھا تو کوئی سائیکل پر اور کوئی پیدل تک تو کوئی کشتی پر۔ یہ لوگ پیرس کے جس قدر قریب ہوتے جاتے تھے۔ اسی قدر تعداد میں بڑھتے جاتے تھے، ان کا قافلہ پھیلتا جاتا تھا اور بڑھتا جاتا تھا، ان قافلوں میں سینٹ ایٹنی کے کان کن تھے، ان میں نارمنڈی کے کسان تھے۔ موسیلے کے فولاد کے کارخانوں کے مزدور تھے، لیانس کے طالب علم تھے، فرانس کے جنوبی ساحل کے گڈریے تھے اور برگنڈی کے شراب کشید کرنے والے مزدور تھے۔

"لوگوں کے دل کے دل راستہ میں فرانس کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے سورماؤں کی یادگاروں پر پھول چڑھاتے۔ آنسو پونچھتے، مٹھیاں بھینچتے اور امن کے نعرے لگاتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔"

یہ کانفرنس پانچ دن تک ہوتی رہی اور فرانس کے شہروں میں سے ہجوم در ہجوم لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے پہنچ رہے تھے۔ لیکن یورپ کے دیگر شہروں میں بھی عام مزدور، کسان، طالب علم، استاد اور پروفیسر معاہدہ اوقیانوس کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے، وہ امن کانفرنس زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے، چنانچہ ان دنوں تمام یورپ اور ایشیا کے ممالک کے عوام نے امن کیلئے گلی کوچوں، فیکٹریوں اور کھیتوں، سکولوں اور کالجوں مسجدوں اور کلیساؤں، لائبریریوں اور لیبارٹریوں میں ہر جگہ عوام نے جنگ کے خلاف آواز بلند کی۔ ان ممالک میں جن کے حاکم معاہدۂ اوقیانوس پر دستخط کرکے اپنے عوام سے غداری کر رہے تھے۔ زبردست مظاہرے ہوئے، اٹلی کے تمام شہروں میں ان مظاہرین اور پولیس کے درمیان کئی بار تصادم ہوا۔ اطالوی کسانوں نے اعلان کیا۔

"اطالوی کسان برطانوی اور امریکی شہنشاہوں کے لئے ایک قطرہ خون بھی بہانے کیلئے تیار نہیں ہیں"

یہی وجہ تھی کہ جب کانفرنس شروع ہوئی تو مندوبین نے صرف امن کے لئے لفظی اعلان ہی نہیں کئے۔ بلکہ اس کانفرنس نے ثابت کر دکھایا کہ امن کا حصول صرف تحریکوں اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اسکے لئے بنیادی کام سرمایہ دار ممالک کے حکمرانوں کے جنگی منصوبوں کی قلعی کھولنا اور ان کو شکست دینا ہے۔ چونکہ جب تک یہ حکمران قائم و دائم رہتے ہیں۔ اس وقت تک امن کا خواب ایک خواب ہی رہے گا، یہی وجہ تھی۔ کہ جب چین کا وفد سپاہیوں کی وردی پہنے بندوقیں ہاتھ میں سنبھالے کانفرنس میں شریک ہوا تو پوری کانفرنس تالیوں سے گونج اٹھی۔ اور عوام کی آنکھیں کھل گئیں، کیونکہ انہیں اب محسوس ہو رہا تھا کہ امن کی حفاظت بہت دفعہ کانفرنسوں سے باہر میدان جنگ میں بھی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ چین کے مجاہد، ویٹ نام کے دلیر، انڈونیشیا کے بہادر، یونان کے چھاپہ مار اور فرانکو کے مخالف کانفرنسوں میں نہیں باہر میدان جنگ میں بھی اپنے خون سے امن کی حفاظت کر رہے ہیں اور جنگ چاہنے والوں کا عرصۂ حیات تنگ کر رہے ہیں، اسی لئے ان ممالک کے نمائندوں نے پوری کانفرنس کا رنگ بدل دیا، اور لوگ سمجھ گئے۔ کہ کس طرح سے امن کی حفاظت اور ملکی آزادی اور سچی جمہوریت کی لڑائی ایک ہی لڑائی ہے، جو اپنے ملک میں سچی جمہوریت کے لئے نہیں لڑ سکتا۔ وہ امن عالم کیلئے بھی نہیں کر سکتا، چنانچہ جب اطالوی سوشلسٹ لیڈر رینی نے کہا۔

"ہم اس پلیٹ فارم سے تمام ان لوگوں کی طرف جو جنگ روکنا چاہتے ہیں۔ بھائی چارے کا ہاتھ بڑھاتے ہیں، لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر یہ ہاتھ جھٹک دیا گیا تو بالکل یہ ہاتھ گھونسہ بھی بن سکتا ہے، اگر ہماری امن کی اپیلوں پر کان نہ دھرے گئے اور اٹلانٹک پیکٹ کے مصنفوں نے تیسری جنگ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی تو پھر ہمارا جواب بغاوت کی صورت میں ہوگا۔ تمام دنیا میں علم بغاوت بلند کر دینگے"

تو جنگ چاہنے والوں کے خلاف ان الفاظ کی گونج اور تالیوں کا شور کئی منٹ تک تھمنے نہ پایا۔

اعلان نامہ

اس کانفرنس نے متفقہ طور پر مندرجہ ذیل اعلان نامہ پاس کیا۔

ہم عوام کے نمائندے جو دنیا کے ۷۲ ممالک سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں، ہم ہیں مختلف اقوام کے لوگ ہیں، مختلف مذاہب اور اعتقادات کے مرد اور عورتیں ہیں، ہم سب نے اس عظیم خطرے کو محسوس کیا ہے۔ جو آج پوری دنیا پر منڈلا رہا ہے، یہ عظیم خطرہ — جنگ کا خطرہ ہے عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے ابھی چار سال گزرے ہیں کہ اب مختلف ممالک کے عوام کو پھر ہتھیار تیز کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، سائنس کو جس کا

پہلا اور آخری مقصد بنی نوعِ انسان کیلئے خوشحالی مہیا کرنا ہے، اپنے صحیح مقاصد سے ہٹا کر جنگی منصوبوں کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے، مختلف ممالک میں جنگ کے جو شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وہ صرف اس لئے روشن ہیں کہ بیرونی ممالک اور ان کی فوجیں ان ممالک کی زندگی میں مداخلت کر رہی ہیں۔

ہم — جو اس عظیم الشان عالمگیر امن کانگرس میں جمع ہوئے ہیں۔ صاف صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں، کہ ہم نے اپنی قوتِ فیصلہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا کمزوری نہیں آنے دی اور نہ ہی ہمارے دماغ جنگ بازوں کے پراپیگنڈے سے متاثر ہوئے ہیں۔

ہم — جانتے ہیں کہ عظیم مملکتوں کے مابین جو معاہدے ہوئے تھے۔ اور جن کی رو سے یہ امکانات پیدا ہوئے تھے۔ کہ مختلف معاشرتی نظام ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکیں ان معاہدوں کو کس نے توڑا ہے

ہم — جانتے ہیں کہ آج اقوام متحدہ کے منشور کو کون پرزے پرزے کر رہا ہے

ہم — جانتے ہیں کہ کون قومیں امن و آشتی کے معاہدوں کو ردی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتیں، کون مسائل کو گفت و شنید سے حل نہیں کرتیں، جو تخفیف اسلحہ کی تمام تجاویز کو مسترد کر دیتی ہیں کون خود کو ایڑی سے چوٹی تک مسلح کر رہی ہیں — یہی ہیں جو جنگ چاہتی ہیں اور انہوں نے اپنے اعمال سے اپنے کو بے نقاب کر دیا ہے۔

ایٹم بم دفاع اور حفاظت کا ہتھیار نہیں ہے،

ہم — ان شعبدہ بازوں کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتے۔ جو ممالک کے ایک گروہ کو دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا چاہتے ہیں۔

ہم — فوجی گروہ بندیوں کے خلاف ہیں، کیوں کہ ان گروہ بندیوں کے تلخ نتائج کی یادیں ہمارے دماغ سے محو نہیں ہوئیں،

ہم — نوآبادیاتی نظام کے مخالف ہیں، کیوں کہ اس نظام میں مسلسل مسلح چپقلش ہوتی رہتی ہے، اور یہی عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے

ہم — مغربی جرمنی اور جاپان کو مسلح کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، کیونکہ اس کا مطلب عوام کے قاتلوں کے ہاتھ میں ایک بار پھر ہتھیار دینا ہے

مختلف ممالک کے گروہوں کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کی جا رہی ہے، ان کے ساتھ اقتصادی تعلقات کے قیام میں جان بوجھ کر رخنہ اندازی کی جا رہی ہے، اور اس اقتصادی ناکہ بندی نے جنگی ناکہ بندی کا روپ اختیار کر لیا ہے۔

اعصابی جنگ کے حامیوں نے اب دھمکیوں سے بڑھ کر باقاعدہ جنگی کارروائیاں شروع کر دی ہیں، لیکن یہ عالمگیر امن کانگرس عوام کی زبردست اور شدید خواہش کا اظہار کرتی ہے، کہ اب دنیا کے عوام مجبور تماشائی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اپنے مستقبل کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کا پختہ عزم کر چکے ہیں۔ اور اسکے لئے وہ سرگرم عمل ہیں۔

یہ عالمگیر امن کانگرس اعلان کرتی ہے

— ہم مجلس متحدہ اقوام کے منشور کا احترام کرتے ہیں اور ان تمام فوجی معاہدوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ جو اس منشور کو بیکار کر دیتے ہیں اور جنگ کا موجب بنتے ہیں،

ہم فوجی اخراجات میں ناقابلِ برداشت اضافے کے زبردست مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عوام کی غربت میں اضافہ ہوتا ہے،

ہم ایٹم بم اور دوسرے ہلاکت آفریں ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی کا زبردست مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام طاقتیں اپنی فوجوں میں کمی کریں اور ایٹمی طاقت پر مؤثر بین الاقوامی کنٹرول نافذ کیا جائے، تاکہ اس طاقت کو انسانی بہبودی اور خوشحالی ہی کے لئے صرف استعمال کیا جا سکے۔

ہم قومی آزادی اور مختلف ملکوں اور قوموں کے تعاون اور اشتراکِ عمل کے زبردست حامی ہیں۔ اور ہم تمام قوموں کے حق خود اختیاری کا مطالبہ کرتے ہیں، کیوں کہ قومی آزادی، حق خود اختیاری کے بغیر امن اور آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔

ہم ان تمام پالیسیوں کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہیں۔ جن کی رو سے جمہوری حقوق کو کچلا جاتا ہے اور پھر بالکل دبا دیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے لئے فضا کو ساز گار بنایا جاسکے۔

ہم سچائی اور استدلال کی حفاظت کیلئے دنیا بھر کے عوام کا ایک جمہوری محاذ ہیں، جس کا مقصد جنگ خواہوں کے پراپیگنڈے کو شکست دینا ہے۔

ہم جنگی صنعتوں، نسلی امتیاز اور اقوام کی باہمی دشمنی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور نئی جنگ کا پراپیگنڈہ کرنے والے اخبارات، رسالوں اور فلموں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اور ان کے بائیکاٹ کئے جانے کا خیر مقدم کرتے ہیں

ہم جنہوں نے تمام دنیا کے عوام کا ایک فولادی اور ناقابل تسخیر محاذ قائم کیا ہے۔ اپنی تمام کوششیں امن کے لئے صرف کرنے کا حلف اُٹھاتے ہیں۔ ہم امن کی حفاظت اور جنگ کے خلاف ہوشیار رہنے کے فیصلہ کن ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عالمگیر امن کانگرس کی بین الاقوامی کمیٹی کے قیام کا اعلان کرتے ہیں، اس کمیٹی میں تمام تہذیبی کارکن اور جمہوری ادارے شامل ہوسکیں گے۔ یہ جمہوری محاذ جنگ بازوں کو قدم قدم پر ٹوکے گا اور عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بل پر امن نافذ کرے گا۔

عورتوں اور ماؤں کو جو دنیا کو نئی امیدیں وو لیعت کرتی ہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم ان کے بچوں کی سلامتی اور ان کے گھروں کی حفاظت کو ایک مقدس فریضہ تصور کرتے ہیں، نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ ہماری بات سنیں اور بلا لحاظ مذہب اور عقیدے کے متحد ہو جائیں۔ تاکہ ان کی نوجوان زندگیاں موت اور ہلاکت کی منحوس پرچھائیوں سے محفوظ رہیں۔

عالمگیر امن کانگرس خلوصِ دل سے اعلان کرتی ہے کہ امن کی حفاظت دنیا کے تمام لوگوں کا مقدس فرض ہے،
ساٹھ کروڑ مردوں اور عورتوں کی نمائندہ عالمگیر امن کانگرس دنیا بھر کے عوام کو پکار پکار کر کہتی ہے،

امن کی جدوجہد میں ہمت اور محنت سے کام کرو!
ہم یہاں یکجا ہوئے ہیں، ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا ہے
ہم امن کی جنگ جیتنے کا حلف اٹھاتے ہیں۔
امن کی جدوجہد زندگی کی جدوجہد ہے۔

• • • • •

"عوام کے لئے جنگ کے معنی ہیں خون اور آنسو، بیوائیں اور یتیم، ویران گھرانے پامال جانیں اور گھسٹتے ہوئے بڑھاپے۔ لیکن مٹھی بھر امریکی قصائیوں کے لئے جنگ کچھ اور ہی معنی رکھتی ہے ——
ان کے نزدیک جنگ کے معنی ہیں۔ ٹھیکے، اسلحہ اور گولہ بارود کے آرڈر
بہی کھاتے اور منافعے
—————!

(ایلیا اہرن برگ)

فریڈرک جولیو کیوری کا خطاب

شبلی بی کام

"خواتین، حضرات اور پیارے رفیقو! میں مؤتمرِ امن کی مجلسِ منتظمہ کی طرف سے دلی مسرت کے ساتھ آپ لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہوں جس نے ۱۰ مارچ کو مجھے اپنا صدر منتخب کر کے میری عزت افزائی کی۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کا خیر مقدم صرف کمیٹی کی طرف سے نہیں کر رہا، بلکہ فرانس کے وہ لاکھوں باشندے بھی میرے ہمنوا ہیں۔ جن کو اس بات پر فخر ہے کہ اُن کا دارالحکومت ایسے لوگوں کے اجتماع کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جو عوام کی متاعِ امن کو مؤثر طور پر محفوظ رکھنے کیلئے متمنی ہیں۔"

مؤتمرِ امن کی فرانسیسی کمیٹی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پروفیسر کیوری نے کہا کہ حکومتِ فرانس نے اپنے وعدوں کے باوجود مؤتمر کے بہت سے مندوبین کو اجازت نامے مہیا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اسلئے وہ اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے۔ حکومتِ فرانس کے اس غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف دنیا بھر کے لاکھوں امن پسند عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ لوگ اس قابلِ مذمت فیصلے کو بہت زیادہ اہمیت نہ دینگے۔ کیونکہ حکومت نے اس طرزِ عمل سے دراصل اپنی کمزوری اور خوف — سچائی سے خوف — کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے سچائی کو پھیلنے کیلئے اجازت ناموں کی ضرورت نہیں ہوتی!

اس اجتماع میں آپ جس سچائی کا اظہار کریں گے وہ تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود دنیا کے طول و عرض میں پھیل کر رہے گی اور اس سے اُن لوگوں کی آنکھیں بھی کھل جائیں گی۔ جو اس خطرے کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ جو امنِ عالم کو پیش آنے والا ہے۔

ہمیں اپنی مشکلات کا پورا پورا احساس ہے۔ کیونکہ خوش قسمتی سے انسدادِ جنگ کے لئے امن پسندوں کا یہ پہلا اجتماع نہیں ہے اور ہم پورے وثوق کے ساتھ جد و جہد کے میدان میں کود سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی۔ ہمارے پاس کافی قوت ہے، اور ہمیں اپنے طریق کار پر بھروسہ ہے۔ ہم محض شرارت پسندوں کی مذمت کرنے پر ہی اکتفا نہ کریں گے۔ ہم جنگ کے خداؤں سے امن کی بھیک مانگنے کے لئے جمع نہیں ہوئے۔ بلکہ ہم یہ مطالبہ اُن سے زبردستی منوا کر رہیں گے!

ابھی چند سال ہی گزرے ہیں کہ ہم نے متحدہ طور پر فاشزم کے خلاف کامیاب جنگ کی ہے۔ ہم میں سے بعض کھلے آسمان کے نیچے لڑے اور بعض نے محکومی کی تاریکی میں اپنا فرض ادا کیا۔ آپ کو اس زمانہ کی تمنائیں اور آرزوئیں یاد ہیں۔ اگر نہیں تو اپنے ذہن میں ذرا منشورِ اطلانتک اور یالٹا اور پوٹسڈم کے معاہدوں کی یاد تازہ کیجئے۔ جن کو ادارۂ اقوامِ متحدہ کا بنیادی پتھر ثابت ہونا تھا۔

جنگ کے زمانے میں مختلف الخیال اتحادیوں نے ان معاہدوں پر محض اس امید میں دستخط کئے تھے کہ مشترک فتح کے بعد دائمی امن کا قیام یقینی ہو جائیگا۔ جنگ کے زمانہ میں جن قوموں کو تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اُن کی دلی خواہش تھی کہ دنیا میں امن قائم ہو جائے اور محنت کش طبقہ اطمینان و فارغ البالی کی زندگی بسر کرے۔ وہ اپنے اپنے ملک کی تعمیرِ نو کی متمنی تھیں۔ اُن میں کافی جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس وقت خصوصاً کاروباری حلقوں میں ایسے کمینے اور چالاک لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جن کو اُن ممالک کی طرف سے خطرہ درپیش تھا جو آزادی حاصل کرنے کے بعد تہذیبِ انسانیت کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ یہ لوگ ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ جب وہ پھوٹ ڈال سکیں اور کھلم کھلا رجعت پسندانہ پالیسی اختیار کر سکیں۔ اُن کا مقصد محض روپیہ کمانا تھا۔ خواہ اس اقدام سے ایک اور جنگ ہی کیوں نہ چھڑ جائے

دراصل سرمایہ دارانہ ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہو سکتی ہے!

چنانچہ ان لوگوں نے پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی۔ اور شروع میں تو وہ خاموشی اور سکون سے کام کرتے رہے۔ لیکن بعد میں اُن کی مہم میں تیزی اور ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ اور اُنھوں نے روزن برگ اور گوئبلز کی اصطلاحات بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کیا۔ اُنھوں نے رُوس کو دنیا کے سامنے ایک ہوّا بنا کر پیش کیا۔ ان پروپیگنڈا کرنے والوں میں زیادہ تر سٹہ باز، بدمعاش اور مقبوضہ علاقوں کے غدار شامل تھے۔ وہ پریس کے اکثر حصوں

اور بعض سیاسی پارٹیوں کی قیادت پر تسلط جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ بعض ممالک میں جو حکومتیں برسراقتدار آئیں۔ وہ بھی یہی ہتھکنڈے استعمال کر کے سیاسی، معاشی اور فوجی محاذوں پر پے در پے حملے کرنے میں کامیاب ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر یونان کے شاہی فاسستوں کی امداد، ترکی پر تسلط، ویٹ نام اور انڈونیشیا کے اندر جنگ اور فرانکو کی حمایت!

ہمیں معلوم ہے کہ اقوام متحدہ میں بھی ایسے ممالک کی اکثریت ہے جو اقتصادی دباؤ اور قوی پروپیگنڈے کے زیر اثر امریکی سامراجیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھیل رہے ہیں۔ اور اب یہ راز کی بات نہیں رہی۔

پھر غیر مسلح ہونے کی تمام تجاویز مسترد کی جا چکی ہیں۔ اور ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی لگانے کی تجویز کا جو حشر ہوا ہے۔ وہ بھی سب کے سامنے ہے!

اگر ہم ان حقائق پر فوجی چوکیوں کے قیام کی روشنی میں غور کریں، اگر ہم یہ دیکھیں کہ فوجی چوکیاں کہاں کہاں قائم کی گئی ہیں، اگر ہم اُن فوجی معاہدوں کا مطالعہ کریں۔ جن پر حال ہی میں دستخط کئے گئے ہیں۔ مثلاً عہد نامہ برسلز اور معاہدہ شمالی اوقیانوس تو ہم یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ جس جنگ کے غار میں ہمیں دھکیلا جا رہا ہے وہ سوویٹ یونین کے خلاف ہے۔ اور یہ وہی جنگ ہے۔ جس میں رجعت پسند قوتیں اعلانیہ اور خفیہ طور پر ۱۹۱۷ء سے مصروف ہیں۔ غرض جنگ کے بڑھتے ہوئے اندیشوں کے پیش نظر اب وقت آگیا ہے کہ ترقی اور امن کی خواہشمند جماعتیں اتحاد اور یکجہتی سے کام لیں۔ بلکہ میرے نزدیک اب تک جنگ کی قوتوں کے خلاف ہمیں امن کیلئے ایک زبردست مہم کا آغاز کر دینا چاہیئے تھا۔

آج سرمایہ دار اقتصادی بحران سے جتنا خوفزدہ ہے اتنا ۳۲ سال پہلے نہیں تھا۔ کیونکہ حقیقی یا اعصابی جنگوں کے باوجود اشتراکی نظام قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ماتحت اقتصادی بحران کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سرمایہ دار مقابلہ و مسابقہ سے متنفر ہے۔ اگر اُسے اپنے نصب العین پر اعتماد ہوتا تو وہ اس نصب العین کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کرتا جو اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کرنے کا موجب بن رہا ہے۔

اگر یہ محض ایماندارانہ خیالات کی جنگ ہوتی یا تجربات کے درمیان دیانتدارانہ تقابل کی کوشش ہوتی تو فوجی قوت کی نمائش اور ایٹم بم کے استعمال کی دھمکیوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض اقتصادی کساد بازاری کو ٹالنے کے لئے ہے۔ حالانکہ اس کے اثرات پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس غرض کیلئے سرمایہ دار ممالک مغربی یورپ میں اپنے پاؤں پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ترقی پسند قوتوں کو دبا نہ دیا جائے۔ سرمایہ داروں کا پروگرام واضح ہے۔ اب تمام ملکوں کے عوام ہی کی متحدہ طاقت انکے ارادوں کو ناکام بنا سکتی ہے۔

جنگی تیاریوں کے تباہ کن نتائج کا اندازہ کسی حد تک ہمارے اپنے ملک میں بھی ہو سکتا ہے۔ جو اقتصادی "امداد" عوام کو مسلح کرنے کی ہمہ گیر سکیم اور روس کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

اقتصادی احتیاج اور سیاسی بالادستی دو طریقے ہیں۔ جن کو بہت سے ممالک پر (جن میں فرانس بھی شامل ہے) مسلط کیا گیا ہے۔ مارشل پلان کے ذریعہ امداد حاصل کرنے والے ممالک جن میں معاہدہ اوقیانوس سے متعلقہ ممالک بھی شامل ہیں، مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ آزادانہ طور پر تجارت نہیں کر سکتے۔ متحدہ امریکہ کے مطالبہ اور مشورہ پر ایسی اشیا کی نیم خفیہ فہرستیں تیار کر لی گئی ہیں۔ جنہیں اشیائے برآمد میں شامل نہیں کیا جائیگا۔

اس طریق کار کے ناگزیر نتائج صنعتی بحران اور بیروزگاری کی صورت میں ظاہر ہونگے۔ کسی ملک کو بیرونی غلامی کے جال میں پھنسانے کے لئے پیشکاری ایک مہیب خطرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے۔ میرے رفیق گلسن نے صحیح کہا ہے۔ "یہ واضح ہوگیا ہے۔ کہ وہ ہمارے خون کو اپنے ڈالروں سے خریدنا چاہتے ہیں!" موسیو گلسن نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے۔ اُن کی مسٹر کینن کے اُس بیان سے پوری تصدیق ہوتی ہے جو انہوں نے ایک ہفتہ قبل ایوان نمائندگان میں دیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ کروڑوں امریکی نہایت گرمجوشی کے ساتھ امن کے خواہشمند ہیں۔ اور وہ مسٹر کینن کے بیان کی مذمت کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل

نیو یارک میں مدبرین کی جو امن کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ اُس کی یاد ہمارے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے۔ ان معزز اور حوصلہ مند لوگوں کو ایک مشکل کام انجام دینا ہے۔ کیونکہ تمام پریس اور ریڈیو وغیرہ اُن اشخاص کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو دوسروں کو بھی جنگ میں گھسیٹنے پہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں انہیں اس پروپیگنڈا کا لازمی طور پر مقابلہ کرنا ہے۔ جو اُن کے متعلق یہ خیال پیدا کر سکتا ہے۔ کہ مغربی یورپ کے لوگ اس پالیسی سے متفق ہیں۔ جو جنگ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمیں اپنے کام اور قراردادوں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا ہے کہ مغربی یورپ کے عوام جنگ کے خلاف ہیں۔ امن کے ان حامیوں کی مہم کو آسان بنانے کیلئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کے ہموطنوں کو یہ یقین دلانے میں ممد ہوں کہ اُن کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے۔ نیز یہ کہ اُن کی وسیع القلبی کی روایات، اخوت اور آزادی کے نعروں سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسا جوا کھیلنے پہ آمادہ کیا جا رہا ہے۔ جو کسی طرح ایک استعماری مہم سے کم نہیں۔ ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو ممالک ایٹم بم کے بل بوتے پر احساس برتری میں مبتلا ہیں۔ اُن پر یہ واضح ہونا چاہیئے۔ کہ جنگ سب کے لیئے خوفناک خونریزی ثابت ہوگی۔

پروفیسر کیوری نے اُن ممالک کے بجٹ کا تجزیہ کیا جو قومی دفاع کے بہانے سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ تعلیم سائنٹیفک اور فنی تحقیقات صحت عامہ اور تعمیر وغیرہ جو انسانیت کے ارتقا کے لیئے لازمی ہیں۔ ان ممالک کے بجٹ کے اخراجات میں غیر اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ مضرت رساں چیز یہ ہے کہ سائنس کو جنگی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال ایٹم بم ہے جسے عام قتل و غارتگری کے مقصد کے پیش نظر بنایا گیا ہے یہ امر واضح ہے کہ ایٹمی ہتھیار کو جنگ عالم میں فیصلہ کن درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسکے برعکس ہمیں یقین ہے کہ اگر ایٹمی قوت کو پُرامن مقاصد کے لیئے استعمال کیا جائے۔ تو یہ انسانیت کیلئے نہایت سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایٹمی قوت کو تباہی کے لیئے استعمال نہ ہونے دیں۔ اور اُن لوگوں کی حمایت کریں۔ جو ایٹمی ہتھیار کے استعمال کو غیر قانونی قرار دینا چاہتے ہیں۔ انسانیت کی اس عظیم ذمہ داری کے پیش نظر سائنسدان بھی اس مسئلہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے —!

کسی ایک قوم کے لیئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود کو جنگ سے محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے مشترکہ اقدام کے ذریعہ ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر مرد اور عورت کو اس بات کی پوری طرح محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ امن و جنگ کے سوال کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ افراد کے لیئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ تمام دنیا میں لوگ اسی مسئلہ کو حل کرنے اور امن کیلئے جدوجہد جاری رکھنے میں مصروف ہیں۔ ہم میں سے بہتوں نے جو جنگ کے مخالف ہیں۔ امن کیلئے متعدد تحریکیں بھی منظم کی ہیں۔ اُن کے خلوص پہ شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ قیام امن کے لیئے ہماری خواہش میں انفعالیت پیدا ہو جائے۔

ہم اُن لوگوں کو بھی جنگ کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جن کو ابھی تک اِن کا احساس تک نہیں ہے۔ جو لوگ ہمارے ساتھ مل کر امن کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو ہر طرح کی سہولت دی جائے گی۔ لیکن جو لوگ جنگ کے خواہش مند ہیں اُن سے مخاطب ہو کر ہم کہتے ہیں۔ کہ تم کو ہم سے نبٹنا پڑے گا۔ ہم تمام ایماندار لوگوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ جنگ کی خطرناکیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اپنی طاقت کا علم ہے اور ہم متحد ہو کر اس اُمید کے ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے کہ:۔

انجام کار فتح ہماری ہے

٭ ٭ ٭ ٭

امن خطرے میں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ زندگی کی عزیز ترین قدریں خطرے میں ہیں۔ اگر ہم خاموش رہے۔ تو بعد میں دست تاسف ملنا پڑے گا۔

اقبال شمیم

چینی نمائندے نے کہا

مجھے چوالیس چینی مندوبین کی جانب سے یہ کہنا ہے کہ ہم عالمگیر امن کانگرس کے اس تاریخی اجلاس میں، جس کے انعقاد کا شرف عوامی جمہوریت چیکوسلاویکیہ کے صدر مقام پراگ کو حاصل ہے، شمولیت پر مسرور و شاداں ہیں اور چین کے ساڑھے سینتالیس کروڑ شہریوں کی طرف سے میں عوامی جمہوریت چیکوسلاویکیہ کی حکومت اور لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ہم پوری قوت اور طاقت سے فرانس کی رجعت پسند حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جس نے فرانسیسی عوام کی خواہش کے برعکس، چینی وفد کو فرانس میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ امریکی سامراجیوں کے دباؤ کے زیر اثر حکومت فرانس، عالمگیر امن کی بقا کے مقدس نصب العین کو نقصان پہنچانے کی اس کوشش سے تمام دنیا کی آنکھوں میں ایک عظیم جرم کی مرتکب ہوئی ہے۔ دنیا کے تمام لوگ، جن میں فرانس کے عوام بھی شامل ہیں، اسے کبھی بھی فراموش نہیں کرینگے۔ حکومت فرانس نے امن کے خلاف، امریکی سامراج کی حمایت حاصل کرنے کی امید میں سخت فضول اور بے معنی اقدام کیا ہے۔ اُس کے لئے بہتر ہے۔ کہ وہ چیانگ کائی شیک کو یاد رکھے۔ جس غدار سے اس حقیقت کے باوجود کہ اُسے امریکی سامراج کی مکمل حمایت حاصل تھی، چینی عوام نے اقتدار چھین لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکی سامراجیوں کے تمام کاسہ لیسوں اور کٹھ پتلیوں کا جلد یا بدیر وہی حشر ہوگا۔ جو اس کا ہوا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ عظیم میں جرمنی کو یورپ میں، اور ایشیا میں جاپان کو دنیا کی نمایاں غیر فاشی طاقتوں کی مضبوط اور مستحکم کوششوں کے باعث شکست فاش ہوئی۔ اور ان کوششوں میں سوویٹ یونین کے عوام کی سرفروشانہ جدوجہد تو مخصوص حیثیت کی حامل ہے۔ اس بات کو چار سال سے کم عرصہ بھی نہیں گزرا اور ابھی تو صلح کے عہد ناموں پر دستخط بھی نہیں ہونے پائے یہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں لوگوں کو آزادی سے سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا۔ کہ جنگی عزائم رکھنے والے سامراجیوں نے تیسری عالمگیر جنگ کا شور و غل مچانا شروع کر دیا ہے آج دنیا دو واضح اور نمایاں کیمپوں میں منقسم ہے۔ ایک طرف تشدد پسند کیمپ ہے۔ جس کا راہنما امریکی سامراج ہے۔ اور دوسرا امن اور جمہوریت کے علمبرداروں کا کیمپ ہے۔ جس کی قیادت اشتراکی ریاست سوویٹ یونین کر رہی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے امریکی سرمایہ دار مالا مال ہو گئے تھے اور اب وہ اپنی منفعت کو قائم رکھنے کے لئے دنیا پر چھا جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ڈالروں کا سبز باغ اور ایٹم بموں کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اُن کا وسیع شیطانی دامِ تزویر کرہ ارض کے تمام گوشوں پر پھیل رہا ہے۔ وہ فوجی اڈوں کا جال بچھانے کے لئے ان تھک کام کر رہے ہیں۔ اور مختلف ممالک میں رجعت پسند طاقتوں کو ہر ممکن امداد دے رہے ہیں۔ امریکی سامراج ان رجعت پسند طاقتوں کو مدد دے رہا ہے جو عوام کو دبانے اور نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ممالک میں قومی آزادی کی قوی تحریکوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو قوموں اور ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کو غصب کرنے کے لئے ہر قسم کے ہلاکت آفریں اور مذموم معاہدے کر رہے ہیں۔ یہ امن پسند قوموں کی دنیا میں امن قائم رکھنے کی کوششوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ وہی ہیں۔ جنہوں نے اقوام متحدہ کے منشور کو پاؤں تلے روندا ہے۔ جنگ کا خطرہ حقیقی ہے۔ امریکی سامراج دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بیچارے، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اچھی اصطلاحیں بھی تو نہیں گھڑ سکتے۔ وہ اپنی بدنامی کو سوویٹ یونین پر مطلق العنان ریاست کا لیبل چپکا کر تھوپ رہے ہیں۔ جو فی الواقعی امن کی محافظ ہے۔

ہمارے زمانے میں لفظ "امداد" کے پاکیزہ مفہوم کو امریکی سامراج کے انتہائی جارحانہ عزائم کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم چینی اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ صرف سوویٹ یونین ہی نے چین کے ساتھ ناجائز اور غیر مناسب کئے ہوئے معاہدوں کی تنسیخ میں ہماری مدد کی ہے ۱۹۲۶ء-۱۹۲۷ء میں سوویٹ یونین نے سامراج کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہماری مدد کی۔ جب جاپانی لٹیروں اور تباہ کاروں نے چین پر حملہ کیا۔ تو سوویٹ یونین نے ہمیں جنگ آزادی میں غیر مشروط طور پر مدد دی، لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ امریکی عوام قدرتی طور پر چینی عوام کے دوست ہیں لیکن امریکہ کی سامراجی حکومت نے تمدن اور معاشرت کے میدان میں جارحانہ پالیسی کو عمل میں لانے کیلئے ہمیشہ چینی رجعت پسندوں، جنگی راہنماؤں اور سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کیا ہے۔ جاپانی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد کے ابتدائی ایام میں امریکی سرمایہ داروں نے جاپان کو کپاس خام، لوہا، تیل، اسلحہ اور مشینری کثیر تعداد میں مہیا کر کے جارحانہ جنگ میں اُس کی مدد کی۔ یہ بھی سچ ہے کہ پرل ہاربر کے حادثے کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ نے جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن امریکہ چین کے بارے میں ہمیشہ چینی اور امریکی عوام کی خواہشات کی برعکس پالیسی پر کاربند رہا ہے۔ امریکہ نے کومنتانگ پارٹی کی حمایت کی ہے اور اُس کے مقابلے میں چین کی عوامی فوج کی کبھی مدد نہیں کی جو جنگ آزادی لڑ رہی تھی، مشرق میں جاپان کے سقوط پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حکومت امریکہ نے کومنتانگ کے رجعت پسندوں کو مدد دینی برابر جاری رکھی اور چین میں ان کی افواج کو ہتھیار بند کیا اور وہاں جنگی اڈے بھی تعمیر کئے۔ دوسری جنگ کے خاتمے کے بعد کومنتانگ حکومت کی امداد اور امریکی مقیم فوجوں کے اخراجات کے متعلق معتبر حلقوں نے جو اندازے لگائے ہیں۔ اُن کے مطابق امریکہ کو چین میں چھ ارب امریکی ڈالروں کا خرچ برداشت کرنا پڑا ہے۔ امریکی سامراج نے چینی رجعت پسندوں کی مدد اسلئے کی تھی۔ تاکہ چین کو نوآبادی میں تبدیل کیا جائے اور روس کے خلاف ایک اڈا بنایا جائے۔ لیکن چین میں امریکہ کی مداخلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اُس نے ایسی تباہی پھیلائی جس کی مثال تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اب چین کے عوام ان گنت مصائب سہنے کے بعد امریکی سامراج کے جارحانہ عزائم کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ آج ہر کوئی جانتا ہے کہ چین میں امریکی سامراج کا پروردہ رجعت پسند چیانگ کائی شیک چینی عوام کی مسلح افواج کے ہاتھوں قطعی اور دائمی شکست کھا چکا ہے۔ لیکن امریکی سامراجیوں نے کسی تک بھی اپنے مزاج کو نئے سانچوں میں نہیں ڈھالا۔ وہ جاپانی فاشیوں کے پسماندگان کی برابر امداد کر رہے ہیں۔ اور سوویٹ یونین اور یورپ کے عوام کے خلاف مذموم اور ہلاکت آفرین پلاٹ تیار کر رہے ہیں۔ امریکی سامراج دنیا کی بقا کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اور بین الاقوامی عہد ناموں کی صریحاً خلاف ورزی کر رہا ہے۔ جبکہ انتہائی بے شرمی کے ساتھ اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کی پیڑی کی قسم بھی اٹھائی جاتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں، وہ لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے پرانے فاشی طریقے استعمال کر رہا ہے۔ امریکی سامراج یورپ کے عوام اور تمام انسانیت کیلئے خطرہ ہے۔ اور اسی ڈھنگ پر چل رہا ہے۔ جو اُس نے چینی عوام کے وجود کو سرے ہی سے خطرے میں ڈالنے کیلئے اختیار کیا تھا ہم چینی ان بین الاقوامی جنگ کو ہوا دینے والوں کو انسانیت کا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک نئے جنگی بحران کو پیدا ہونے کی کبھی بھی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ دنیا بھر کی امن پسند طاقتوں کو ابھی ایک دوسرے کے اور قریب آنا چاہیئے تاکہ اس خطرے کو منظم اور باقاعدہ طور پر ختم کیا جا سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکی عوام دوسرے ممالک کے عوام کی طرح جنگ کے خواہشمند نہیں۔ صرف وال سٹریٹ کے درندے اور جنگ کا شور مچانے والے مجرم ضمیر دلوگ، جنگ چاہتے ہیں کیونکہ جنگ اُن کیلئے فائدہ مند ہے، ان کی تجوریوں کے منہ بھرے گی۔ لیکن اس سے وہ اپنے آپ اپنی قبریں کھود رہے ہیں۔ جنگ کے بعد تمام ممالک کے عوام صعوبتوں کی ایک طویل راہ طے کر چکے ہیں، سوویٹ یونین کو جنگ کے بعد اپنے پنجسالہ منصوبے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے، اور مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریت روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ اور مشرق میں قومی آزادی کی تحریکیں ایک جگہ کے بعد دوسری جگہ پر پوری قوت اور گونج گرج کے ساتھ ابھرتی آ رہی ہیں۔ اور اسی طرح سرمایہ دار ممالک کے عوام بیدار اور متحد ہوتے جا رہے ہیں، اگر جمہوریت اور امن کا علمبردار کیمپ جس کی قیادت روس کر رہا ہے، مضبوطی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا رہا تو امن یقیناً قائم ہو کر رہے گا۔ یہ کیمپ تو جنگ کی تیاری کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی استطاعت بھی رکھتا ہے، ہم چین کے عوام سو سال سے بھی زائد عرصے سے طاغوتی طاقتوں کے خلاف

برسرِ پیکار ہیں۔ اور جب سے ہماری یہ جدوجہد شروع ہوئی ہے۔ متعدد قربانیاں دی جا چکی ہیں اور ابھی ہم پورے عزم کے ساتھ برابر لڑ رہے ہیں۔ میں ماضی میں، زیادہ دور نہیں جانا چاہتا۔ لیکن میں پچھلے دس برس کی کئی مثالیں پیش کرنی چاہتا ہوں۔ چینی عوام نے جاپانی سامراج پر آٹھ سالہ شدید لڑائیوں کے بعد فتح حاصل کی۔ ہم نے جاپان کے سقوط کے بعد رجعت پسند کومنتانگ حکومت کو جسے امریکی سامراج کی پوری حمایت حاصل تھی ختم کرنے کے لئے اُسی عزم کا مظاہرہ کیا اور اُس کا حساب بھی اُسی طرح بیباق کیا گیا۔ جس طرح ہم نے جاپانیوں کا سودا چکایا تھا۔ تقریباً تین سالہ پیہم جدوجہد میں عوام کیلئے جنگ آزادی لڑنے والی فوج نے ساڑھے انچاس لاکھ کومنتانگ فوجیوں کا صفایا کیا اور چین کے آدھے سے زیادہ علاقے کو جس کی آبادی بیس کروڑ ہے، آزاد کرایا۔ عملی طور پر تمام امریکی اسلحہ جو دشمنوں کی ملکیت تھا۔ عوامی فوج کے ہاتھ لگا۔ اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار پیش کرتا ہوں۔ ہم نے تین ہزار تیرہ ٹینکوں، بارہ ہزار چھبیس فوجی لاریوں، دو لاکھ سولہ ہزار سات سو چھیاسٹھ مشین گنوں، سینتیس ہزار دو سو سینتالیس توپ خانے سے متعلقہ آلات اور چھبیس کروڑ نو لاکھ اٹھانوے ہزار اکتیس گولیوں پر قبضہ کیا۔ اس میں شک نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ امریکی سامراج کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے چینی، مسلح عوامی فوجوں کو ہتھیار مہیا کرتے رہے اور امریکہ بالفاظ دیگر ہمارے لئے اسلحہ مہیا کرنے کا ڈپو بن گیا۔ وہ دن بہت جلد قریب آ رہا ہے۔ جب ساڑھے سینتالیس کروڑ چینی ہمیشہ کے لئے آزادی حاصل کر لیں گے۔ ہم نے ایک بے مثال فتح حاصل کی ہے۔ ہماری فتوحات ایک دور کی تعمیر سے کم نہیں۔ جس کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ کیونکہ ہم نے صرف اپنے لئے آزادی حاصل نہیں کی بلکہ امریکی سامراج کی طاقت کو مشرقی محاذ پر درہم برہم کر دیا ہے۔ جس سے امریکہ کے جارحانہ جنگ کے منصوبوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے والا دھکا لگا ہے۔

چین کے عوام نے اتنی عظیم الشان فتح کیسے حاصل کر لی؟ یہ فتح اس لئے ممکن ہوئی کہ چین کے عوام چین کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں متحد ہو گئے، جس نے عوام کی بے لوث خدمت کی اور ایک لاجواب اور پیہم جدوجہد شروع کر دی گئی۔ فتح اس لئے ممکن ہوئی۔ کہ ہمیں صحیح قیادت میسر ہے، ہم میں مضبوط اتحاد اور پُر جوش عزم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلحہ کی کمی کے باوجود فتحیاب ہوئے اور ہم نے تشدد پسند سامراجیوں کو کچل دیا۔ چین کے عوام کا تجربہ اس بات کا بیّن مظاہرہ کرتا ہے کہ دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے اور باشعور محنت کش جماعت کی راہنمائی میں مضبوط اتحاد اور پُر عزم جدوجہد کے بل بوتے پر سامراجی تباہ کاریوں کی فوجی اور سیاسی چالوں کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ ہم چینی یقیناً جنگ سے پیار نہیں کرتے، اس جذبے کو ہماری پانچ ہزار سالہ تاریخ نے جنم دیا ہے۔ ہمارا قومی نعرہ "امن قیمتی" ہے۔ لیکن ہم عوامی اور جمہوری امن کے قائل ہیں نہ کہ جھوٹے اور ڈھکوسلے امن کے،

اس امر کے باوجود کہ ہم نے غیر ملکی تشدد کے ہاتھوں نقصان اٹھایا ہے اور ہمیں بہت بُری طرح لُوٹا گیا ہے۔ لیکن ہم امن کی راہ میں ہر ایک رکاوٹ کو دور کرنے کے کام میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہم چین میں ایک انقلابی جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو گھر میں سچا امن اور دنیا میں پائدار امن کے قیام کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔

ہمارے نظریے کے مطابق انسانیت دوستی اور آشتی ہی سے برقرار رہ سکتی ہے اور مشترکہ کوششوں سے ہی ترقی کر سکتی ہے۔ چین کے عوام اس سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ امن ایک بہترین انعام ہے، جسے ہر ایک قوم کو جیتنا چاہیئے۔ اور ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے عوام رضاکارانہ طور پر اپنی تمام تر کوششوں کو عالمگیر امن کے قیام میں صرف کر رہے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ مشرق بعید کے عوام جنہیں سامراج نے دبا رکھا ہے۔ ہماری اس خواہش میں برابر شریک ہیں۔ ان میں سے بعض کو امن کانگرس میں نمائندے بھیجنے سے روکا گیا ہے۔ اسلئے ہم ان کی طرف سے بھی یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مشرق بعید کے تمام لوگ بلاتخصیص پائدار عالمگیر امن کے قیام کیلئے اپنی تمام تر توانائیں صرف کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں متحد ہو کر امن کے لئے ٹھوس جدوجہد شروع کر دینی چاہیئے۔ ہمیں دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ ہونا چاہیئے کیونکہ اسی کے باعث ہم نئی جارحانہ جنگ کے خطرے کو ٹال سکتے ہیں۔ اگر تشدد پسندوں نے کسی طرح بھی نئی جنگ شروع کرنے کی جرأت کی تو دنیا بھر کی عوامی طاقتیں انہیں کچل دینگی۔ اور ان کے سامراجی نظام کو تہس نہس کر دینگی۔ بالآخر ہم تمام انسانیت کو آزاد کروا لیں گے۔

دنیا بھر کی امن پسند طاقتو! متحد ہو جاؤ! اپنے مستحکم اتحاد اور مسلسل جدوجہد سے جنگ کا خاتمہ کر دو! عوامی جمہوریت کی فتح پائندہ باد۔

میرزا ادیب

اگر امن کانفرنس میں پاکستانی نمائندہ ہوتا

محترم ساتھیو!

میں پاکستان کا نمائندہ ہوں۔ پاکستان ایشیا کی ایک نوزائیدہ ریاست ہے۔ جس کے آغوش میں آٹھ کروڑ انسان سانس لے رہے ہیں۔ اور جس کی حدیں ہندوستان کے ساتھ ساتھ بحیرہ عرب اور خلیج بنگالہ کے ساحلوں پر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ افغانستان، چین، روس، اور ایران ہمارے ہمسائے ہیں اور بظاہر لوگوں نے ابھی ابھی انگریزوں کی سہ صد سالہ غلامی سے نجات حاصل کی ہے۔ پاکستان — آج سے دو سال پیشتر اس نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر موجود نہیں تھا۔ مگر اب ایک نیا ملک — ایک طاقتور اور امن پسند ملک ایک نئی امنگ اور نئے ولولے کے ساتھ آپ کو دیکھ رہا ہے — نہ صرف دیکھ رہا ہے۔ بلکہ آپ کے دوش بدوش امن کی خاطر عملی اقدام میں بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہے۔

ہم فطرتاً امن پسند ہیں۔ امن سے رہنا اور امن پسندوں کا ساتھ دینا ہماری بہت بڑی آرزو ہے۔ اب تک برطانوی شہنشاہیت اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہمارے بہادر اور پامرد جوانوں کو جنگ کا ایندھن بناتی رہی ہے۔ مگر اب ہم اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں اب ہم جنگ کی آگ کو بھڑکانے کے لئے جنگ نہیں کریں گے۔ بلکہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے جنگ کریں گے اور ان سامراجی طاقتوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ جو دنیا کا امن تباہ کرکے غریب کچلے ہوئے، سسکتے ہوئے عوام سے اُن کا سب کچھ چھین لیتی ہیں۔ اور سات سمندر پار جاکر سونا اگلنے والی سرزمین میں بیکاری اور فاقہ کشی کے بیج بو دیتی ہیں! دنیا کی دوسری جنگ عظیم میں ہمارے باہمت جوان آپ کے دوش بدوش فاشی درندوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ اب اگر فاشی درندگی کوئی خاص ملک یا خاص بلاک اختیار کرلے۔ تو یقیناً آپ ہمیں اپنے دوش بدوش پائیں گے۔ ہمارا نعرہ امن ہے جنگ نہیں۔ ہمیں جنگ کے لفظ سے بھی نفرت ہے

پاکستان کے آٹھ کروڑ انسانوں کو امن کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میرا ملک انتہائی گرمجوشی سے امن قائم کرنے والی تمام انجمنوں کا خیر مقدم کرتا رہا ہے اور اس عظیم الشان کانفرنس کا بھی خیر مقدم کرتا ہے۔ دو دن ہوئے جب میں نے امن کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پیرس کی سرزمین میں قدم رکھا اور میرا تعارف چند نئے ساتھیوں سے کرایا گیا۔ تو میں نے ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سنیں — ایسی عجیب و غریب باتیں جو حقائق سے اسی قدر دور ہیں۔ جس قدر ان باتوں کے پھیلانے والوں سے صداقت شعاری اور حقیقت بیانی دور ہے، کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی انگریزوں کا سایہ ہمارے سر سے اٹھا ہم لوگ جنگلی درندوں کی طرح آپس میں برسرپیکار ہوگئے۔ اور ہمارے عوام نے انتہائی بے رحمی سے ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلسل کئی ماہ تک ہمارے ہاں جو کچھ ہوتا رہا۔ اس کے بیان کرنے کے لئے میری زبان میں طاقت نہیں ہے۔ تباہی اور بربادی کا مہیب سے مہیب اور بھیانک سے بھیانک نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے لائیے۔ لیکن یاد رکھیئے۔ یہ نقشہ اس درندگی، اس بہیمیت اور اس ظلم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جس کی چکی میں مدت تک ہم لوگ پستے رہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری اس خانہ جنگی کے محرکات کیا تھے۔ اور وہ کیا حالات تھے۔ جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بحیثیت مصنف کے میرا اعتقاد ہے کہ دنیا کے سب عوام ایک ہیں۔ کوئی جغرافیائی حدبندی، کوئی دیوارِ چین اور کوئی سدِ سکندری عوام کے

درمیان رکاوٹ بن کر نہیں ٹھہر سکتی۔ عوام کبھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوسکتے۔ ایک دوسرے کے دشمن بادشاہ اور حکمران ہوتے ہیں سرمایہ دار اور جاگیردار ہوتے ہیں۔ شہنشاہیت کے ایجنٹ اور جنگی ہتھیار بنانے والے کارخانوں کے مالک ہوتے ہیں۔ غریب ملکوں کو منڈیاں بنانے والے دولت مند اور بم اور ایٹم بم بنانے والے سامراجی نمائندے ہوتے ہیں۔ جب سے ہمارے نیم براعظم میں برطانوی سامراج نے قدم رکھا تھا اس کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی۔ کہ اس سرزمین میں بسنے والے مختلف فرقوں کے دماغوں میں فرقہ پرستی کا زہر پھیلاتا رہے، دیسی نوابوں، جاگیرداروں اور خود غرض لیڈروں کا سہارا لے کر یہ سامراج ڈھائی سو سال تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ فرقہ پرستی کا زہر پھیلتا رہا، بڑھتا رہا۔ اور دشمنی اور عداوت کی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ اور جب انگریز یہاں سے جانے لگے۔ تو انہوں نے انتہائی فریب کاری سے کام لے کر ہمارے فرقہ پرست لیڈروں سے سمجھوتہ کرلیا۔ ناسمجھ عوام اپنے حقیقی دشمنوں کو نہ پہچان سکے اور اپنے بھائیوں ہی پر پل پڑے۔ برطانوی سامراج اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہوگیا، فرقہ پرست لیڈر عوام کی خونچکاں لاشوں کی سیڑھیاں بنا کر بلندیوں پر چڑھ گئے اور عوام — ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ اگر ہم اپنے حقیقی دشمنوں کو پہچان لیتے تو یہ ٹریجڈی کبھی نہ ہوتی۔ جب عوام اپنے اصلی دشمنوں کو پہچان لیتے ہیں۔ تو انقلاب روس اور چینی عوام کی جدوجہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور جب صحیح دشمنوں کو نہیں پہچان سکتا۔ تو وہ کچھ ہوتا ہے۔ جو کچھ ہمارے نیم براعظم میں ہوا —!

مجھے افسوس ہے کہ شروع ہی میں دلخراش باتیں سنانا پڑیں۔ مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھا — اس لئے مجبور تھا کہ آپ کو بتاؤں کہ ہمارے زخم رسیدہ، کچلے ہوئے اور اُجڑے ہوئے عوام کو امن کی کس قدر ضرورت ہے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد خانہ جنگی نے ہمیں تباہ کردیا ہے۔ ابھی تک ہم اُن زخموں پر پھاہے بھی نہیں رکھ سکے جو وہ جنگوں نے ہمارے جسموں پر لگائے ہیں۔ ابھی تک ہم اُن دکھی بہنوں کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکے۔ جن کے شوہر اُن سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ ابھی تک ان ماؤں کو سہارا ابھی نہیں مل سکا۔ جن کے بچے ان کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں ملا دیئے گئے ہیں۔ اور ابھی تک ہمیں ان بچوں کو دلاسہ دینے کی بھی فرصت نہیں مل سکی۔ جن کے سروں سے ان کے والدین کا سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ چکا ہے — ابھی ہمیں مجروح جسموں کی مرہم پٹی کرنا ہے۔ ابھی ہمیں اپنے بنیادی حقوق کے لئے تگ و دو کرنا ہے۔ اور ابھی ہمیں اپنی حقیقی آزادی کی جنگ لڑنا ہے۔ کیا ان حالات میں ہم جنگ کی تیاریاں کرنے والے، ایٹم بم بنانے والے، نزدیک و دور فوجی اڈے قائم کرنیوالے بلاک میں شامل ہوسکتے ہیں ؟؟؟؟

یہ خوشی کی بات ہے کہ پورے ایشیا میں اب بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لوگ سامراج کی شاطرانہ چالوں کو سمجھتے جا رہے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں سفید فام شہنشاہیت کا دامن، اس قدر سیاہ ہوچکا ہے کہ بحر اوقیانوس، جس کی کے نام سے جنگی معاہدے کر رہی ہے — کا پانی بھی اس سیاہی کو نہیں دھوسکتا۔

میرے ہموطنوں کو جنگ سے بھی نفرت ہے اور جنگ چاہنے والوں سے بھی۔ پاکستانی جنگ کا لفظ تک سننا پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ان لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں۔ جو جنگ کے منصوبے باندھ کر دنیا کو ایک بار اور تباہی کے جہنم میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ ہم بدستور آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ سالہا سال تک ہم جس آزادی کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ گزشتہ پچاس برس میں ہم نے جس آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں اور جس آزادی کے حصول کے لئے ہم عرصہ دراز تک کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ ابھی ہم سے دور ہے۔ آج سے دو سال پہلے جن کرسیوں پر ہمارے سفید فام آقا بیٹھ کر ہمیں لوٹتے کھسوٹتے رہتے تھے۔ آج ان پر سیاہ فام افسر بیٹھ کر ہمارے حقوق پامال کر رہے ہیں۔ آقاؤں کے تبدیل ہوجانے سے آزادی نہیں مل سکتی تو محترم رفیقو! اس صورتِ حال میں یہ بھی ممکن نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنی موجودہ تگ و دو سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنے موجودہ اور پہلے آقاؤں کے مفاد کی خاطر اپنے آپ کو جنگ کے شعلوں میں گرا دیں۔ ہم اپنی جدوجہد میں ضرور کامیاب ہونگے۔ سارا ایشیا۔ سارا مشرق اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوگا۔ چین، ویت نام، برما اور انڈونیشیا، کی سرزمین سے انقلاب و بغاوت کا جو طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے بے دست و پا

سامراج کو تنکوں کی طرح اپنی لہروں میں بہا کر لے جائے گا!

پیارے رفیقو! میں امن کانفرنس کی سٹیج سے جس ملک کی نمائندگی کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ وہ آپ کے ملکوں سے کافی مختلف ہے تعلیمی اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے ہم بہت پیچھے ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم پانچ فیصد سے بھی کم ہے۔ ہمارے ہاں مشینوں کی انتہائی قلت ہے۔ ہمارے ہاں روٹی کا مسئلہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے عوام بھوکے ننگے ہیں۔ بیکار اور بیمار ہیں۔ بے گھر بے آسرا ہیں۔ اپنوں اور غیروں نے انہیں بُری طرح لوٹ لیا ہے۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر رکاوٹ ہے۔ قدم قدم پر مصیبت کا پہاڑ ہے — مگر میں سامراج اور سامراج کے ایجنٹوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کچلے ہوئے جسموں، ان بھوکے ننگے انسانوں اور ان تباہ حال عوام کے سینوں میں انقلاب کی آگ کے وہ شعلے بھڑکنے لگے ہیں جن کے سامنے سامراج کی بنائی ہوئی مضبوط سے مضبوط آہنی دیوار بھی برف کی دیوار بن کر رہ جاتی ہے! سب سے پہلے تو ہمیں فرسودہ نظام کو بدلنا ہے۔ رجعت پرستوں کا مقابلہ کر کے انہیں پیچھے ہٹانا ہے۔ بیکاری اور غربت کی لعنتیں دور کرنا ہیں۔ تعلیمی ادارے قائم کرنا ہیں۔ صنعت و حرفت کو ترقی دینا ہے۔ ہسپتال قائم کرنا ہیں۔ اس قسم کے ہزاروں کام ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ رجعت پسند جنگ کی آگ بھڑکا کر ہماری توجہ ان مسائل سے ہٹا نہیں سکتے

جنگ کون چاہتا ہے؟

جنگ وہ لوگ چاہتے ہیں جو بے گناہ انسانوں کو کٹوا کر، خوفناک جنگی ہتھیار بنا کر اپنے ڈالروں کے انبار میں اضافہ چاہتے ہیں!

جنگ کی تیاریاں وہ لوگ کر رہے ہیں۔ جو دوسرے ملکوں کے مادی وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں!

اور جنگ کی خواہش انہی لوگوں کو ہے جو اپنے باغی عوام کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹانا چاہتے ہیں!

امریکہ کے لئے بہتر چیز یہ ہے کہ وہ وال سٹریٹ کے سرمایہ داروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی بجائے تباہ حال اور بیکار امریکیوں کو روزگار مہیا کرے۔ جو اس وقت لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے اس دولت مند ترین ملک میں گھوم رہے ہیں۔

اور برطانیہ کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ " بلاک سازی " کی بجائے اپنے ننگے بھوکے مزدوروں کے جائز مطالبات پورا کرے۔ جو مجبور ہو کر ہر دوسرے روز ہڑتال کر رہے ہیں۔

محترم رفیقو! میں آخری بار پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کے عوام آپ کے ساتھ ہیں — امن قائم ہو گا — امن زندہ رہے گا!

دُنیا کا امن پائندہ باد!

// • • • • • //

" آج دُنیا دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک گروہ سرمایہ داروں کا ہے۔ جو عوام کو جنگ کے جہنم میں دھکیل کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ جمہور کا ہے۔ جو جنگ نہیں چاہتا اس کشمکش میں فتح جمہور کو ہو گی۔

سامراجی نظام ختم ہو رہا ہے اور بہت جلد ختم ہو جائے گا "

////

جائزے

"میرے بھی صنم خانے"

مصنفہ:۔ قرۃ العین حیدر ضخامت ۴۸۶ صفحات قیمت چھ روپے پبلشر مکتبہ جدید لاہور

"میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے۔ یہ پژمردہ سماج کی کامیاب عکاسی، انکے افسانوں کی ایک مسلمہ خصوصیت ہے۔ ناول میں اُنھوں نے صرف عکاسی ہی نہیں بلکہ اس طبقہ پر بڑے لطیف اور موثر انداز میں چوٹیں بھی کی ہیں۔ ناول کے کردار خوشحال گھرانوں کے افراد ہیں، ان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان بھی ہیں اور اودھ کے تعلقدار بھی، جو پہاڑوں پر رنگ رلیاں مناتے ہیں، کلبوں اور ہوٹلوں کے متوالے ہیں، جن کی محبت میں بھی تصنع ہے اور نفرت میں بھی بناوٹ۔ ناول کے پلاٹ میں یہ کردار اس چابکدستی سے سموئے گئے ہیں اور ایسی کامیابی کے ساتھ ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں بورژوا طبقہ کے بے مصرف صبح و شام، اور کھوکھلی اور مصنوعی سوسائٹی کا پورا خاکہ آجاتا ہے۔ اور وہ بے ساختہ نتیجہ نکالتا ہے۔ کہ اس کے دن اب پورے ہو گئے اور وہ نزع کے عالم میں آخری سانس لے رہا ہے۔

سنہ ۴۵ء و سنہ ۴۷ء کے وقفے میں اس برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی میں فرقہ وارانہ منافرت کا زہر بری طرح سرایت کر چکا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش ہندو مسلم آویزش پر منتج ہو چکی تھی، دنیا کے سب سے گھناؤنے اور بھیانک قتل عام سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے دامن ملوث ہو چکے تھے زندگی کی وہ ساری قدریں جو ایک سچے فنکار کو عزیز ہوتی ہیں۔ بُری طرح روندی گئیں، تہذیب پامال اور تہذیبی زندگی مسخ ہو گئی۔ "میرے بھی صنم خانے" کے کردار بھی اس طوفان سے دوچار ہوتے ہیں۔ گو فسادات کا تذکرہ ناول کے آخری حصہ میں آتا ہے۔ اور ان کا تعلق پلاٹ سے ایسا زیادہ گہرا نہیں لیکن یہ حصہ ایک اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے۔

ہمارے بعض فنکاروں نے، ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں۔ جو کبھی ترقی پسند تحریک میں آگے آگے ہونے کا دعوےٰ کرتے تھے، فسادات کو ایک انسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ بلکہ فرقہ پرستی کی عینک لگا کر اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے یہ اچھی خاصی ناخوشگوار بحث بن گئی ہے۔ ایک حلقہ ایسا ہے کہ سارا الزام ہندوؤں اور سکھوں کے سر تھوپتا ہے اور مسلمانوں کو بالکل معصوم و مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا مسلمانوں کو جابر ظالم اور فسادی گروہ ماننے میں سارا زورِ قلم صرف کر دیتا ہے۔ یہ دونوں رجحان اسی قدر افسوسناک اور باعث شرم ہیں جس قدر کہ خود فسادات۔ خوشی کی بات ہے کہ قرۃ العین حیدر نہ صرف یہ کہ ان رجحانات کا شکار نہیں ہوئیں۔ بلکہ اُنھوں نے نہایت ہی متوازن اور حد درجہ موثر انداز میں بلا امتیاز قتل و غارتگری لوٹ کھسوٹ اور نفرت و حقارت کی مذمت کی ہے۔ یہ اسلئے اور بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ مصنفہ ادب کی افادیت کے بارے میں کسی مخصوص سماجی نظریے کی پابند نہیں ہیں یا کم از کم پابند نہ ہونے کی دعویدار ہیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جب ترقی پسند نظریے کے بعض حامی افراد موقعہ پرستی اور جاہ طلبی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے قلم کو فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے اور سماج کے دشمنوں کی پردہ پوشی کرنے کے لئے فروخت کر رہے ہیں، قرۃ العین حیدر کا ان کی صفوں سے علیحدہ رہنا انکے فن کی سچائی کی دلیل ہے۔

تقسیم ہند کے موقعہ پر جو فسادات ہوئے موقعہ پرست لیڈروں نے عوام کو جس طرح استعمال کیا اور دھوکہ دیا، جو تہذیب اور قدریں پامال ہوئیں، قرۃ العین حیدر نے بڑے خلوص اور حد درجہ دردناک انداز میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

ناول میں یوں بھی جگہ جگہ بڑا موثر تیز و تند سیاسی طنز موجود ہے۔ جو ایک طرف کانگریسی حکومت کی ریاکاری کو اجاگر کرتا ہے۔ تو دوسری طرف ان نام نہاد مسلم لیگی لیڈروں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ جو مذہب کے نام پر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلے اور برا وقت آتے ہی غریب مسلمانوں کو مصیبتوں میں مبتلا چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

بحیثیت مجموعی "میرے بھی صنم خانے" ایک دلچسپ اور موثر ناول ہے، گو اس میں قرۃ العین حیدر کا مخصوص رومانی انداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو اگر متوازن ہوتا۔ تو ناول زیادہ کامیاب ہوتا۔ لیکن پھر بھی اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ بلاشبہ ہمارے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

("عارف")

ماہنامہ ادبِ لطیف عوام کی مقدس امانت ہے
جس کی پوری زندگی عوام کے لئے وقف ہے
ادبِ لطیف
کھوکھلا دعوےٰ نہیں بلکہ زندہ حقیقت ہے
جس کا اعتراف بار بار کیا جا چکا ہے
سالنامہ ادبِ لطیف
عظیم نقادوں بیباک ادیبوں اور البیلے شاعروں کے فنی شعور اور
ذہنی ارتقا کا حسین و جمیل مرقع ہے جس میں عوامی زندگی اپنے تیکھے خدو خال
کے ساتھ ایک واضح اور غیر مبہم تصویر مرتب کرتی نظر آتی ہے۔
اڑھائی سو صفحے، قیمت دو روپے چار آنے
چوہدری برکت علی، میرزا ادیب اور قتیل شفائی نے ترتیب دیا
مکتبہ اردو لاہور
احمد ندیم قاسمی
اوپندر ناتھ اشک
ممتاز مفتی
ابراہیم جلیس
کنہیا لال کپور
مختار صدیقی
ریاض محمود
ضیا جعفری
شاد عارفی
فکر تونسوی
مخمور جالندھری
شریف کنجاہی
نذیر مرزا برلاس
اعجاز بٹالوی
بلراج کومل
ضمیر جعفری
خلیل الرحمٰن اعظمی
احمد راہی
حسن طاہر
افضل پرویز
احمد ظفر
مقبول احمد پوری
انور جلال
رضا ہمدانی
کرشن موہن
قرۃ العین حیدر
جوش ملیح آبادی
صلاح الدین احمد
چراغ حسن حسرت
غلام باری
اختر انصاری
مہندر ناتھ
ابوالفضل صدیقی
عبدالمجید بھٹی
یوسف ظفر
تنویر نقوی
قیوم نظر
صوفی تبسم
اے حمید
بلونت سنگھ
فارغ بخاری
غلام ربانی تاباں
خاطر غزنوی
ابن انشاء
سلام مچھلی شہری
تخت سنگھ
سلطانہ قمر
جگن ناتھ آزاد
جمیل ملک
ممتاز شیریں
حمید شاہد
منظر سلیم

REGD. L. No 3521.